رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ | جلد ۳۶ | عدد ۳

ماهنامه

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک" اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے | اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۳۹	محرم وصفر ۱۳۷۲ھ ۔ مطابق اکتوبر و نومبر ۱۹۵۲ء	عدد ۱، ۲

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۲
تفہیم القرآن	″	۹
مقالات :-		
اسلامی دستور کی بنیادیں	″	۳۳
اسلامی نظام تعلیم	″	۵۳
سُنّتِ رسول	شیخ مصطفیٰ السباعی	۸۱
چند احادیث پر اعتراض اور ان کا جواب	ابوالاعلیٰ مودودی	۹۷
رسائل و مسائل :-		
پوسٹ مارٹم اور دیگر طبی مسائل	″	۱۱۸
انسان کے فطرت پر پیدا ہونے کا مفہوم	″	۱۲۶
منگنی کا شرعی حکم	″	۱۲۸
استمنا بالید کا شرعی حکم	″	۱۲۸
حدِ شرعی کی تشریح	مولانا امین احسن اصلاحی	۱۳۳
مطبوعات	غلام علی	۱۳۵

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ایک شخص نے اٹھ کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ اعلان کیا کہ آؤ، میرے پیچھے چلو، میں دین کا جھنڈا بلند کروں گا۔ مسلمان ہر طرف سے سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے ان کے سامنے دھواں دھار تقریر کی اور پورے زور کے ساتھ اس ارادے کا اظہار کیا کہ صدیوں سے دینِ حق کی جو عمارت ویران پڑی ہے، اب انشاء اللہ وہ میرے ہاتھوں از سرِ نو اپنی اصلی شان میں قائم ہوگی۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا۔ لوگ انتظار کرنے لگے کہ اب یہ تجدید دین کا مدعی خود آگے بڑھ کر اذان دیگا اور ہمیں مسجد کی طرف لے چلے گا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر لوگوں نے تقاضا شروع کیا کہ حضرت اب دین کے پہلے ستون کو قائم کرنے کا وقت آگیا ہے، حضور صدائے اذان بلند فرمائیں۔ لیکن ہر تقاضے کو وہ ایک کان سن کر دوسرے کان اڑاتا رہا اور جس نے بہت تنگ کیا اسے طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے ٹال دیا۔ آخر کار جب نماز کا وقت تنگ ہونے لگا تو سارا مجمع چیخ اٹھا، ہر طرف سے مطالبہ ہوا کہ اذان دی جائے۔ مجبور ہو کر بے چارے نے بادلِ ناخواستہ اذان دی۔ مگر زبان کی لکنت اور لہجے کی ہچکچاہٹ خبر دیتی رہی کہ یہ اذان کس جذبے کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ جوں توں کر کے اذان کا مرحلہ ختم ہوا۔ لوگ ابھی دعا ہی مانگ رہے تھے کہ داعی دین سیدھا اپنے بنگلے میں داخل ہو گیا۔ لوگ سمجھے کہ حضرت وضو کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ مگر وہ یکایک سوٹ اور ہیٹ پہنے ٹینس کا ریکٹ بغل میں لیے برآمد ہوئے اور موٹر میں بیٹھ کر سیدھے کلب کی جانب چل پڑے۔ یہ عجیب حرکت دیکھ کر مجمع میں پھر ایک بے چینی پیدا ہوئی۔ کچھ لوگ موٹر کے پیچھے دوڑے، کچھ اُس کے آگے آن کھڑے ہوئے اور کلب کا راستہ روک لیا۔ داعی دین نے برافروختہ ہو کر لوگوں کو بہت گالیاں دیں اور چاہا کہ راستہ روکنے والوں کو کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے۔ مگر

کامیابی نہ ہوئی ۔مجبوراً رک جانا پڑا ۔ اب مجمع اصرار کر رہا ہے کہ موٹر مسجد کی طرف چلے ۔ اور داعئ اسلام صاحب اس تاک میں لگے ہوئے ہیں کہ ذرا نکل بھاگنے کا راستہ ملے تو سیدھے کلب کی راہ لیں ۔ اس کشمکش کے دوران میں کبھی وہ خود اپنی زبان سے یہ نہیں فرماتے کہ میں نماز کا قائل نہیں ہوں یا مسجد جانے کے لیے راضی نہیں ہوں ۔ مگر حال یہ ہے کہ مجمع میں جو دس بیس منافق ادھر ادھر بکھرے کھڑے ہیں ان میں سے ہر ایک کو حضرت اس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں جیسے کہ یہی تنکا انہیں ڈوبنے سے بچائے گا ۔ کوئی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے پکار کر کہتا ہے کہ "میاں کس مسجد کی طرف چلیں ؟ اہل حدیث کی ؟ حنفیوں کی ؟ یا شیعوں کی ؟ تمہاری کوئی ایک مسجد ہو تو اس کی طرف چلیں "۔ یہ آواز سنتے ہی حضرت داعئ اسلام کی جان میں جان آجاتی ہے اور وہ نظریں بچا کر نوٹوں کا ایک بنڈل اس کی طرف پھینک دیتے ہیں ۔ کسی طرف سے آواز آتی ہے کہ "کوئی قرآن سے نماز کا طریقہ بتا دے تو میں اسے انعام دوں "۔ داعئ اسلام صاحب فوراً اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور دو ادھرے لہجے میں فرماتے ہیں کہ "حضرت آپ جیسا قیمتی آدمی وہاں کہاں کھڑا ہے ، آئیے میری موٹر میں تشریف رکھیے "۔ اس طرح یہ تجدید دین کا نیک ارادہ رکھنے والے بزرگ ہر طرف سے منافقین کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے گرد جمع کر رہے ہیں تاکہ ان کا بھی ایک جتھہ بن جائے اور اس کی مدد سے موٹر کو کلب کی طرف لے جانے کا موقع مل جائے ۔ لیکن یہ تعداد اتنی تھوڑی ہے کہ اگر یہ سب جمع بھی ہو جائیں تو مجمع عام کے مقابلے میں کچھ نہیں بنا سکتے ۔

یہ ہے مثال اس قیادت کی جس نے اسلامی حکومت کے قیام کا وعدہ کر کے ، اور "پاکستان کا مطلب کیا ۔ لا الٰہ الا اللہ" کہہ کر مسلمانوں کو اپنے پیچھے لگایا تھا جب تک اس وعدے کو وفا کرنے کا وقت نہ آیا تھا ، اس قیادت کی ساکھ مسلمانوں میں جمی رہی ۔ اس پر مسلمانوں نے اتنا اعتماد کیا جتنا شاید ہی کسی قوم نے اپنی قومی قیادت پر کیا ہو ۔ اس کے اشارۂ ابرو پر ساری قوم حرکت کرتی رہی ۔ اس کی تمام کمزوریاں اور خامیاں روز روشن میں مسلمانوں کے سامنے آئیں مگر انہوں نے محض اس مقصد عظیم

کی خاطر ان کی طرف سے آنکھیں بند کریں، اور لاکھوں جانیں، اربوں روپے کی جائدادیں اور ہزارہا عصمتیں قربان کرکے اس قیادت کو وہ اقتدار دلوا کر چھوڑا جس سے وہ اسلامی حکومت کا وعدہ وفا کرنے کے قابل ہوسکے۔ لیکن جب ایفائے عہد کا وقت آگیا اور مسلمان انتظار کرنے لگے کہ یہ قیادت سچے اور ایماندار لوگوں کی طرح خود آگے بڑھ کر اُس چیز کا اعلان کرے گی جس کے وعدے پر اس نے اپنی قوم کا یہ اعتماد حاصل کیا تھا، تو مہینوں پر مہینے گزرتے چلے گئے اور قیادتِ علیا کے مرکز سے صدائے اذان" بلند نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ آخر کار سارے ملک میں شور برپا ہوگیا۔ ہر طرف سے تقاضے شروع ہوئے تار بھیجے گئے۔ خطوط کی بھرمار ہوئی۔ جلسوں میں مطالبے کیے گئے۔ تب کہیں قیامِ پاکستان کے اُنیس مہینے بعد قرار دادِ مقاصد کی" اذان" دی گئی اور وہ بھی صاف الفاظ میں نہیں بلکہ ایسے پیچدار الفاظ میں جن سے بس منطقی استنباط ہی کے طور پر اسلامی حکومت کا مفہوم اخذ کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد پھر ایک طویل وقفہ آیا جس میں لوگ انتظار کرتے رہے کہ اب کچھ اُس" وضو" کی تیاریاں کی جائیں گی جو اسلامی حکومت کی نماز کے لیے ضروری ہے۔ کچھ حکومت کے رنگ ڈھنگ بدلیں گے۔ کچھ نظامِ تعلیم بدلیگا۔ کچھ قوانین میں ردو بدل ہوگا۔ کچھ عوام کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کی تدبیریں کی جائیں گی۔ کچھ کارپردازانِ حکومت کے اخلاق درست ہونگے۔ اور خود لیڈر صاحبان بھی کچھ اپنے طور طریقے ٹھیک کریں گے۔ مگر وہاں سب کچھ ان امیدوں کے برعکس ہوتا رہا اور" اذان" کے اٹھارہ مہینے بعد یکایک یہ قیادت وہ دستوری سفارشات لیے ہوئے برآمد ہوئی جن میں صریح طور پر اسلامی حکومت کے بجائے ایک لادینی حکومت کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ لوگوں کے ہوشیار ہونے سے پہلے ہی گاڑی" سیکولرزم" کی طرف چلا دی جائے، چنانچہ بنیادی حقوق کی رپورٹ جھٹ پٹ دستور ساز اسمبلی میں پاس کر بھی ڈالی گئی، مگر بنیادی اصولوں کا معاملہ اٹک کر رہ گیا اور لوگوں نے ہر طرف سے ہجوم کرکے گاڑی روک لی۔ اس کے بعد سے اب تک پورے ستائیس مہینے اس حال میں گزرے ہیں کہ ایک طرف مسلمان من حیث القوم اُس اسلامی نظام کا مطالبہ کرتے رہے ہیں جس کا وعدہ کرکے ان سے قیامِ پاکستان کے لیے اتنی ہولناک قربانیاں کرائی گئی تھیں، اور دوسری طرف یہ قیادت اس سے یوں جان بچاتی رہی ہے جیسے

کہ اسلامی نظام کسی پھانسی کا نام ہے جو اس کے گلے میں ڈالی جانے والی ہے۔ اس دوران میں اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا کہ اسلام کے دستوری اصول اُسے پسند نہیں ہیں۔ زبان سے وہ اسلام ہی اسلام پکارتی رہی ہے۔ مگر عملاً اس نے ملک بھر سے چُن چُن کر منافقوں کو اکٹھا کیا ہے تاکہ وہ اسلام اور اس کے دستور اور قانون کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائیں۔ روپے دے دے کر دینی حکومت کے خلاف اور لادینی حکومت کے حق میں مضامین لکھوائے ہیں۔ ہر اس شخص کی پیٹھ ٹھونکی ہے جو مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو ابھار ابھار کر سامنے لائے اور اسلامی ریاست کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ پرانے پرانے بدنام کمیونسٹوں تک کو اس نے اسلام کے خلاف استعمال کرنے میں باک نہیں کیا ہے۔ جس شخص کو بھی اس کے دربار میں اعزاز حاصل کرنا ہوتا ہے وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اٹھ کر اسلامی دستور کے مطالبے کو چیلنج کر دیتا ہے اور اس کے چند ہی روز بعد ہم سنتے ہیں کہ اسے کوئی بڑی تنخواہ یا کوئی اونچی کرسی پیش کر دی گئی۔

اس روش کا حاصل کیا ہوا ہے؟ شاید دنیا میں کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملے گی کہ کوئی قیادت پانچ سال کی مختصر مدت میں اپنی قوم کے اندر عزت اور محبوبیت کے اتنے اونچے مقام سے گر کر ذلت اور مبغوضیت کی اتنی نیچی سطح تک گر گئی ہو۔ آج ہزار میں ایک مسلمان بھی مشکل ہی سے ایسا ملتا ہے جو ان لوگوں کو کلمۂ خیر سے یاد کرتا ہو۔ آج ایک راہ چلتے آدمی کو آپ ذرا چھیڑ کر اس کے سامنے ان کا ذکر کر دیں، پھر آپ سن لیں گے کہ وہ کن الفاظ سے ان کی تواضع کرتا ہے۔ آج حالت یہ ہو گئی ہے کہ ریلوں میں، بسوں میں، بازاروں میں، اور چار آدمیوں کی کسی سوسائٹی میں کہیں کوئی شخص اگر ان کی مدافعت میں ایک لفظ زبان سے نکال دے تو اس کو اپنی جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ نفرت اور ناراضی کا ایک طوفان ہے جو دلوں سے اُبل رہا ہے اور زبانوں سے نکلا پڑتا ہے۔ سرکاری ملازمین تک، جو برسر اقتدار گروہ کی مخالفت سے متاثر ہونے میں عموماً سب سے پیچھے ہوا کرتے ہیں، یہ عام ناراضی پھیل چکی ہے، اور چھوٹے کارکنوں سے لیکر بڑے سے بڑے افسروں تک جس کو دیکھیے اس

قیادت کے خلاف شکوہ سنج نظر آ رہا ہے۔ ایک نہایت ناقابل لحاظ اقلیت کے سوا، جس کی موت و زیست اسی قیادت کی کشتی سے وابستہ ہے، اب کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ عام لوگ اس سے بیزار بھی ہیں اور مایوس بھی ــــ یہ جو کچھ ہُوا ہے ٹھیک قانونِ فطرت کے مطابق ہُوا ہے۔ خدا اور اس کے دین سے مکاری کرنے والے کبھی دنیا میں باعزت نہیں رہ سکے ہیں۔

اس درجہ بے وقار اور ساقط الاعتبار ہو چکنے کے بعد اب بھی یہ قیادت اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ قوم کی عام خواہش کو ٹھکرا کر زبردستی اپنی من مانی چلائے۔ یہ جسارت آخر کس بھروسے پر کی جا رہی ہے؟ جن چیزوں پر یہ لوگ اعتماد کیے ہوئے ہیں وہ صرف تین ہیں:۔

اوّل یہ کہ ان کی آئینی پوزیشن مضبوط ہے۔ قبلِ تقسیم کے مخصوص حالات میں مجلس دستور ساز (جو ملک کی پارلیمنٹ بھی ہے) اس طرح بنائی گئی تھی کہ اس میں نہ صرف اُس وقت مسلم لیگ کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی، بلکہ جب تک نیا دستور نہ بن جائے، اس کی یہ اکثریت جوں کی توں قائم رہے گی۔ یہ اسمبلی اس پوزیشن میں ہے کہ تمام ملک کی متحدہ مزاحمت کے باوجود اپنی مرضی کا ایک دستور بنا سکتی ہے اور وہ دستور آئینی طور پر ملک کا دستور قرار پا سکتا ہے۔

دوم یہ کہ ملک کا نظم و نسق عملاً اس وقت ان کے قبضے میں ہے۔ خزانہ، فوج، پولیس، عدالت، جیل، سب ان کے ہاتھ میں ہیں، اور بڑی حد تک تجارت اور خوراک کی کنجیوں پر بھی وہ قابض ہیں۔ ان کو اعتماد ہے کہ ان طاقتوں سے کام لے کر وہ لوگوں کی عام ناراضی کے باوجود زبردستی اپنا من مانا دستور نافذ کر سکیں گے، اور پچھلے صوبائی انتخابات میں جو "کامیاب" تجربے وہ کر چکے ہیں ان کی بنا پر وہ امید رکھتے ہیں کہ لوگ اگر سو فیصدی بھی ان سے ناراض ہوں تو وہ کم از کم ۹۰ فیصدی ووٹ اپنے انتخابی کرتبوں سے ضرور حاصل کر لے جائیں گے۔ اس طرح نہ صرف آج، بلکہ آئندہ بھی وہ اقتدار پر قابض رہنے کی پوری توقع رکھتے ہیں۔

سوم یہ کہ ان کو اپنی قوم کی جہالت اور اخلاقی کمزوریوں پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ

یہاں نہ سرکاری ملازمتوں میں ایمان فروشوں کی کوئی کمی ہے نہ عام پبلک میں، اور قوم کی رائے عام کا حال یہ ہے کہ جھوٹ کا کوئی طوفان اٹھا کر ہر وقت اس کو فریب دیا جا سکتا ہے۔

یہ تینوں چیزیں بے شک ایسی ہیں کہ دنیا کا ہر نادان گروہ انہیں پا کر نخوت کے نشے میں سرمست ہو سکتا ہے اور قدیم ترین زمانے کے جباروں سے لے کر شاہ فاروق تک سب اپنے اپنے وقت میں ان سے سرمست ہوتے رہے ہیں۔ مگر اس طرح کے لوگ بالعموم ایک حقیقت کو بھول جاتے ہیں اور وہی ان کے لیے آخر کار تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ ان کو یہ یاد نہیں رہتا کہ عزت اور اقتدار کے لیے اصل ضمانت، طاقت نہیں بلکہ حکمرانوں پر لوگوں کا قلبی اعتماد ہے۔ اور یہ اعتماد اگر حاصل ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ حکمراں اپنے اخلاق سے اور اپنی خدمت سے لوگوں کے دل مسخر کریں اور جو قدم بھی اٹھائیں اس کے برحق ہونے پر دلیل و حجت سے لوگوں کو مطمئن کر دیں۔ جو حکمراں یہ اعتماد حاصل کر لیتے ہیں ان کو سچی عزت حاصل ہوتی ہے اور ان کا اقتدار مستحکم ہوتا ہے۔ ان کی حکومت ایک بوجھ کی طرح سروں پر لدی ہوئی نہیں ہوتی کہ محض ایک جھٹکا اسے اتار پھینکنے کے لیے کافی ہو، بلکہ اس کی جڑیں لاکھوں کروڑوں بندگان خدا کے قلوب میں گہری جمی ہوئی ہوتی ہیں جن کو اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں ہوتا رہا ہے وہ لوگ جو اس طرح کی چیزوں پر بھروسہ کرتے ہیں جن پر ہماری موجودہ قیادت بھروسہ کر رہی ہے ہم تو وہ ہمیشہ برا انجام دیکھتے رہے ہیں، اور بسا اوقات ان کی حماقتوں سے ان کی پوری قوم پر ایسی تباہیاں نازل ہوئی ہیں جن کی بدولت بعد کی نسلیں صدیوں تک ان پر لعنت کرتی رہی ہیں۔ تاریخ اس قسم کی عبرتناک مثالوں سے بھری پڑی ہے، اور خود اس زمانے میں بھی اس کی نہایت سبق آموز مثالیں ہمارے سامنے آ چکی ہیں۔ اس پر بھی اگر کوئی سبق نہ حاصل کرے تو یہ اس کی اپنی بدقسمتی ہے۔

پچھلے چند مہینوں میں جماعت اسلامی کے کارکنوں نے اسلامی دستور کے لیے پورے پاکستان کی رائے عام کو ہموار کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کے دوران میں ان کو چند نہایت اہم تجربات ہوئے

ہیں اور ان کو ہم یہاں صرف اس لیے بیان کرتے ہیں کہ اگر موجودہ قیادت میں فکر و بصیرت کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو وہ ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرے۔ ہمارے کارکن اس جد و جہد کے دوران میں سڑکوں پر، بازاروں میں، جمعے کے اجتماعات میں، محلّوں اور گلیوں میں، قصبوں اور دیہات میں۔ بلا انتخاب ہر شخص تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور ہر ایک کے سامنے انہوں نے اسلامی دستور کا مطالبہ پیش کیا ہے تاکہ اگر وہ اس سے اتفاق رکھتا ہو تو اس کی تائید کرے۔ یہ ایک طرح کا استصواب عام ہے جس کے دوران میں حسب ذیل نتائج مشاہدے میں آئے ہیں :۔

کم از کم ۹۰ فی صدی آدمی ایسے ملے ہیں جنہوں نے بلا تامل اس مطالبے پر نہ صرف دستخط کیے ہیں بلکہ زبان سے اپنے گہرے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے۔

بقیہ دس فی صدی میں بھی عظیم اکثریت ایسے لوگوں کی پائی گئی ہے جنہوں نے زبان سے اس کی تائید کی ہے، مگر دستخط کرنے سے صرف اس لیے انکار کیا ہے کہ یا تو وہ ملازم ہیں، یا کسی اور طرح موجودہ اقتدار سے ان کا مفاد وابستہ ہے اور ان کو ڈر لگتا ہے کہ اس مطالبے پر اگر ان کے دستخط پائے گئے تو انہیں نقصان پہنچ جائے گا۔

بمشکل ایک فی صدی آدمی ایسے پائے گئے ہیں جنہوں نے اس مطالبے سے یا اس کی کسی شق سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔

کم از کم ۸۰ فیصدی آدمی ایسے پائے گئے ہیں جنہوں نے دستخط کرنے کے ساتھ کسی نہ کسی طور پر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "چاہے ساری قوم بالاتفاق اس چیز کا مطالبہ کرے، مگر ارباب اقتدار کریں گے وہی جو ان کے جی میں ہے" یہ اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ لوگ بالعموم موجودہ قیادت سے مایوس ہیں اور یہ خیال اُن کے ذہن میں بیٹھ گیا ہے کہ یہ قیادت اب استبداد پر اتر آئی ہے اور اسے رائے عام کی بالکل پروا نہیں ہے۔

کم از کم ۲۵ فیصدی آدمی ایسے ملے ہیں جنہوں نے دستخط کرتے ہوئے صرف مذکورۂ بالا مایوسانہ خیالات ہی ظاہر کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ علانیہ کہا کہ "صاحب اِن جلسوں اور قرار دادوں (باقی صفحہ ۴۳ پر)

تفہیم القرآن

الکہف

نام | اس سورہ کا نام پہلے رکوع کی نویں آیت اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں کہف کا لفظ آیا ہے۔

زمانۂ نزول | یہاں سے اُن سورتوں کا آغاز ہوتا ہے جو مکی زندگی کے تیسرے دَور میں نازل ہوئی ہیں۔ مکی زندگی کو ہم چار بڑے بڑے دوروں میں تقسیم کرتے ہیں جن کی تفصیل سورۂ انعام کے دیباچے میں گزر چکی ہے۔ اس تقسیم کے لحاظ سے تیسرا دور تقریباً ۵ نبوی کے آغاز سے شروع ہو کر قریب قریب ۱۰ نبوی تک چلتا ہے۔ اس دَور کو جو چیز دوسرے دَور سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے دَور میں تو قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تحریک اور جماعت کو دبانے کے لیے زیادہ تر تضحیک، استہزاء، اعتراضات، الزامات، تخویف، اطماع اور مخالفانہ پروپیگنڈے پر اعتماد کر رکھا تھا۔ مگر اس تیسرے دَور میں انہوں نے ظلم وستم، مار پیٹ اور معاشی دباؤ کے ہتھیار پوری سختی کے ساتھ استعمال کیے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ملک چھوڑ کر حبش کی طرف نکل جانا پڑا اور باقی ماندہ مسلمانوں کو اور ان کے ساتھ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو شِعب ابی طالب میں محصور کر کے ان کا مکمل معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کر دیا گیا۔ تاہم اس دور میں دو شخصیتیں —— ابوطالب اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ —— ایسی تھیں جن کے ذاتی اثر کی وجہ سے قریش کے دو بڑے خاندان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ۱۰ نبوی میں ان دونوں کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ دَور ختم ہو گیا اور چوتھا دور شروع ہوا جس میں مسلمانوں پر مکے کی زندگی

تنگ کر دی گئی یہاں تک کہ آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت تمام مسلمانوں کو مکّہ سے نکل جانا پڑا۔

سورۂ کہف کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیسرے دَور کے آغاز میں نازل ہوئی ہو گی جبکہ ظلم و ستم اور مزاحمت نے شدت تو اختیار کر لی تھی، مگر ابھی ہجرت حبشہ واقع نہ ہوئی تھی۔ اس وقت جو مسلمان ستائے جا رہے تھے ان کو اصحابِ کہف کا قصہ سنایا گیا تاکہ ان کی ہمت بندھے اور انہیں معلوم ہو کہ اہلِ ایمان اپنا ایمان بچانے کے لیے اس سے پہلے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

موضوع اور مضمون | یہ سورۃ مشرکینِ مکّہ کے تین سوالات کے جواب میں نازل ہوئی ہے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے اہلِ کتاب کے مشورے سے یہ سوالات آپ کے سامنے پیش کیے: اصحابِ کہف کون تھے؟ قصۂ خضر کی کیا حقیقت ہے؟ اور ذوالقرنین کا کیا قصّہ ہے؟ یہ تینوں قصے عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخ سے متعلق تھے۔ حجاز میں ان کا کوئی چرچا نہ تھا۔ اس لیے اہلِ کتاب نے امتحان کے لیے ان کو تجویز کیا تاکہ یہ بات کھل جائے کہ واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی غیبی ذریعۂ علم ہے یا نہیں۔

تعالیٰ نے ان سوالات کے جواب میں یہ سورت نازل فرمائی۔ مگر محض قصے ہی بیان کرنے پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ اپنے قاعدے کے مطابق اُن کو پوری طرح اُس صورتِ حال پر چسپاں کر دیا جو دعوتِ اسلام کے اس مرحلے میں درپیش تھی۔

اصحابِ کہف کے متعلق بتایا کہ وہ اُسی توحید کے قائل تھے جس کی دعوت یہ قرآن پیش کر رہا ہے، اور اُن کا حال آج مکّے کے مٹھی بھر مظلوم مسلمانوں کے حال سے اور ان کی قوم کا حال تم ظالموں کے حال سے مختلف نہ تھا۔ پھر اسی قصے سے اہلِ ایمان کو یہ سبق

ل روایات میں آتا ہے کہ دوسرا سوال رُوح کے متعلق تھا جس کا جواب سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۱۰ میں دیا گیا ہے۔ مگر سورۂ کہف اور بنی اسرائیل کے زمانۂ نزول میں کئی سال کا فرق ہے۔ اور سورۂ کہف میں دو کے بجائے تین قصے بیان کیے گئے ہیں، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرا سوال دراصل قصۂ خضر سے متعلق تھا نہ کہ رُوح سے متعلق۔

دیا کہ اگر کفر کا غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مومن کو ظالم سوسائٹی میں سانس لینے تک کی مہلت نہ دی جا رہی ہو، تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہ جھکانا چاہیے بلکہ اللہ کے بھروسے پر تن بتقدیر نکل جانا چاہیے۔ اسی سلسلے میں کفار کو یہ بھی بتا دیا کہ جس خدا نے اصحاب کہف کو ایک مدتِ دراز تک سُلانے کے بعد پھر زندہ اٹھا دیا اُس کی قدرت سے وہ بعث بعد الموت کچھ بعید نہیں ہے جسے ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔

پھر اصحاب کہف کے قصے سے راستہ نکال کر اُس ظلم و ستم اور تحقیر و تذلیل پر گفتگو شروع کر دی گئی جو مکّے کے سردار اور کھاتے پیتے لوگ اپنی بستی کی چھوٹی سی نومسلم جماعت کے ساتھ برت رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ نہ ان ظالموں سے کوئی مصالحت کرو اور نہ اپنے غریب ساتھیوں کے مقابلے میں ان بڑے بڑے لوگوں کو کوئی اہمیت دو۔ دوسری طرف ان رئیسوں کو نصیحت کی گئی کہ اپنے چند روزہ عیشِ زندگانی پر نہ پھولو بلکہ ان بھلائیوں کے طالب بنو جو ابدی و پائیدار ہیں۔

اسی سلسلۂ کلام میں قصۂ خضر و موسیٰ کچھ اس انداز سے سنایا گیا کہ اس میں کفار کے سوالات کا جواب بھی تھا اور مومنین کے لیے سامانِ تسلی بھی۔ اس قصے میں دراصل جو سبق دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی مشیت کا کارخانہ جن مصلحتوں پر چل رہا ہے وہ چونکہ تمہاری نظر سے پوشیدہ ہیں اس لیے تم بات بات پر حیران ہوتے ہو کہ یہ کیوں ہوا؟ یہ کیا ہو گیا؟ یہ تو بڑا غضب ہوا! حالانکہ اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو تمہیں خود معلوم ہو جائے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے اور بظاہر جس چیز میں برائی نظر آتی ہے، آخر کار وہ بھی کسی نتیجۂ خیر ہی کے لیے ہوتی ہے۔

اس کے بعد قصۂ ذوالقرنین ارشاد ہوتا ہے اور اس میں سائلوں کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم تو اپنی اتنی ذرا ذرا سی سرداریوں پر پھول رہے ہو، حالانکہ ذوالقرنین اتنا بڑا فرمانروا اور ایسا زبردست فاتح اور اس قدر عظیم الشان ذرائع کا مالک ہو کر بھی اپنی حقیقت کو

نہ بھولا تھا اور اپنے خالق کے آگے ہمیشہ سرِ تسلیم خم رکھتا تھا۔ نیز یہ کہ تم اپنی ذرا ذرا سی حویلیوں اور بغیچیوں کی بہار کو لازوال سمجھ بیٹھے ہو، مگر وہ دنیا کی سب سے زیادہ مستحکم دیوار تحفظ بنا کر بھی یہی سمجھتا تھا کہ اصل بھروسے کے لائق اللہ ہے نہ کہ یہ دیوار، اللہ کی مرضی جب تک ہے یہ دیوار دشمنوں کو روکتی رہیگی، اور جب اس کی مرضی کچھ اور ہو گی تو اس دیوار میں رخنوں اور شگافوں کے سوا کچھ نہ رہے گا۔

اس طرح کفار کے امتحانی سوالات کو انھی پر الٹ کر خاتمۂ کلام میں پھر وہی بات دہرائی گئی ہے جسے آغازِ کلام میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ توحید اور آخرت سراسر حق ہیں اور تمھاری اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ انھیں مانو، ان کے مطابق اپنی اصلاح کرو اور خدا کے حضور اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے ہوئے دنیا میں زندگی بسر کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تمھاری اپنی زندگی خراب ہو گی اور تمھارا سب کچھ کیا کرایا اکارت جائے گا۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی[1]۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب، تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے، اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور اُن لوگوں کو ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے[2]۔ اِس بات کا نہ اُنھیں علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا

---

[1] یعنی نہ اس میں کوئی ایچ پیچ کی بات ہے جو سمجھ میں نہ آسکے، اور نہ کوئی بات حق و صداقت کے خطِ مستقیم سے ہٹی ہوئی ہے جسے ماننے میں کسی راستی پسند انسان کو تامل ہو۔

[2] یعنی جو خدا کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں۔ اِس میں عیسائی بھی شامل ہیں اور یہودی بھی اور مشرکینِ عرب بھی۔

کو تھا۔[5] بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ وہ محض جھوٹ بکتے ہیں۔
اے محمدؐ، شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دوگے اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔[6] درحقیقت یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت

---

[5] یعنی ان کا یہ قول کہ فلاں خدا کا بیٹا ہے، یا فلاں کو خدا نے بیٹا بنا لیا ہے، کچھ اس بنیاد پر نہیں ہے کہ ان کو خدا کے ہاں اولاد ہونے یا خدا کے کسی کو متبنّیٰ بنانے کا علم ہے، بلکہ محض اپنی عقیدت مندی کے غلو میں وہ ایک من مانا حکم لگا بیٹھے ہیں، اور ان کو کچھ احساس نہیں ہے کہ وہ کیسی سخت گمراہی کی بات کہہ رہے ہیں، اور کتنی بڑی گستاخی اور افترا پردازی ہے جو اللہ رب العالمین کی جناب میں ان سے سرزد ہو رہی ہے۔

[6] یہ اشارہ ہے اُس حالت کی طرف جس میں اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبتلا تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو رنج اُن تکلیفوں کا نہ تھا جو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، بلکہ جو چیز آپ کو اندر ہی اندر کھلائے جا رہی تھی وہ یہ تھی کہ آپ اپنی قوم کو گمراہی اور اخلاقی پستی سے نکالنا چاہتے تھے اور وہ کسی طرح اُس سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ آپ کو یقین تھا کہ اس گمراہی کا لازمی نتیجہ تباہی اور عذابِ الٰہی ہے۔ آپ ان کو اس سے بچانے کے لیے اپنے دن اور راتیں ایک کیے دے رہے تھے۔ مگر انہیں اصرار تھا کہ وہ خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہی رہیں گے۔ اپنی اس کیفیت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک حدیث میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ "میری اور تم لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی روشنی کے لیے، مگر پروانے ہیں کہ اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں جل جانے کے لیے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ کسی طرح آگ سے بچیں، مگر پروانے اس کی ایک نہیں چلنے دیتے۔ ایسا ہی حال میرا ہے کہ میں تمہیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑتے ہو" (بخاری و مسلم)۔
اس آیت میں بظاہر تو بات اتنی ہی فرمائی گئی ہے کہ شاید تم اپنی جان ان کے پیچھے کھو دوگے، مگر اسی میں ایک لطیف انداز سے آپ کو تسلی بھی دے دی گئی کہ ان کے ایمان نہ لانے کی ذمّہ داری تم پر نہیں ہے اس لیے تم کیوں اپنے آپ کو رنج و غم میں گھلائے دیتے ہو؟ تمہارا کام صرف بشارت اور انذار ہے، لوگوں کو مومن بنا دینا تمہارا کام نہیں ہے۔ لہٰذا تم بس اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کیے جاؤ۔ جو مان لے اسے بشارت دیدو۔ جو نہ مانے اسے بُرے انجام سے متنبہ کردو۔

بنایا ہے تاکہ اِن لوگوں کو آزمائیں اِن میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ آخر کار اِس سب کو ہم ایک چٹیل میدان بنا دینے والے ہیں[1]۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ غار[2] والے اور کتبے[3] والے ہماری کوئی بڑی عجیب

[1] پہلی آیت کا خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اور ان دونوں آیتوں کا روئے سخن کفار کی جانب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک حرفِ تسلی دینے کے بعد اب آپ کے منکرین کو مخاطب کیے بغیر یہ سنایا جا رہا ہے کہ یہ سرو سامان جو زمین کی سطح پر تم دیکھتے ہو اور جس کی دلفریبیوں پر تم فریفتہ ہو، یہ ایک عارضی زینت ہے جو محض تمہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے مہیا کی گئی ہے۔ تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ یہ سب کچھ ہم نے تمہارے عیش و عشرت کے لیے فراہم کیا ہے، اس لیے تم زندگی کے مزے لوٹنے کے سوا اور کسی مقصد کی طرف توجہ نہیں کرتے، اور اسی لیے تم کسی سمجھانے والے کی بات پر کان بھی نہیں دھرتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سامانِ عیش نہیں بلکہ وسائلِ امتحان ہیں جن کے درمیان تم کو رکھ کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ تم میں سے کون اپنی اصل کو فراموش کر کے دنیا کی اِن دلفریبیوں میں گم ہو جاتا ہے، اور کون اپنے اصل مقام (بندگیٔ رب) کو یاد رکھ کر صحیح رویّے پر قائم رہتا ہے۔ جس روز یہ امتحان ختم ہو جائیگا اسی روز یہ بساطِ عیش الٹ دی جائے گی اور یہ زمین ایک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہ رہے گی۔

[2] عربی زبان میں کہف وسیع غار کو کہتے ہیں اور غار کا لفظ تنگ کھوہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر اردو میں غار کہف کا ہم معنی ہے۔

[3] الرقیم کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض صحابہ و تابعین سے منقول ہے کہ یہ اُس بستی کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اور وہ ایلہ (یعنی عقبہ) اور فلسطین کے درمیان واقع تھی۔ اور بعض قدیم مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کتبہ ہے جو اس غار پر اصحابِ کہف کی یادگار میں لگایا گیا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقام وہی ہے جسے بائیبل کی کتاب یشوع (باب ۱۸- آیت ۲۷) میں رقم یا راقم کہا گیا ہے۔ پھر وہ اسے نبطیوں کے مشہور تاریخی مرکز پیٹرا کا قدیم نام قرار دیتے ہیں لیکن انہوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ کتاب یشوع میں رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے (باقی ص۵۱ پر)

نشانیوں میں سے تھے؟[۱] جبکہ وہ چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انہوں نے کہا کہ "اے پروردگار ہم کو اپنی رحمتِ خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کر دے"، تو ہم نے انہیں اسی غار میں تھپک کر چند سال کے لیے گہری نیند سلا دیا، پھر ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ دیکھیں ان میں سے کون اپنی مدتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے۔ ع

ہم ان کا اصل قصہ تمہیں سناتے ہیں[۲]۔ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) سلسلے میں آیا ہے اور خود اسی کتاب کے بیان کی رو سے اس قبیلے کی میراث کا علاقہ دریائے اردن اور بحر لوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں پیٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پیٹرا کے کھنڈر جس علاقے میں پائے گئے ہیں اُس کے اور بنی بن یمین کی میراث کے درمیان تو یہوداہ اور ادومیہ کا پورا علاقہ حائل تھا۔ اسی بنا پر جدید زمانے کے محققینِ آثارِ قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع ۱۹۴۶ء۔ جلد ۱۷۔ ص ۶۵۸)۔ ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقیم سے مراد کتبہ ہے۔

[۱] یعنی کیا تم اُس خدا کی قدرت سے، جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، اس بات کو کچھ بعید سمجھتے ہو کہ وہ چند آدمیوں کو دو تین سو برس تک سلائے رکھے اور پھر ویسا ہی جوان و تندرست جگا اٹھائے جیسے وہ سوئے تھے؟ اگر سورج اور چاند اور زمین کی تخلیق پر تم نے کبھی غور کیا ہوتا تو تم ہرگز یہ خیال نہ کرتے کہ خدا کے لیے یہ کوئی بڑا مشکل کام ہے۔

[۲] اس قصے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے جو سریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ شخص اصحابِ کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کیے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دور کے مفسرین کو پہنچی جسے ابن جریر طبری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گبن نے اپنی (باقی صفحہ ۱۶ پر)

تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔ ہم نے ان کے دل اُس وقت مضبوط کر دیے

(بقیہ حاشیہ ص۱۵) کتاب تاریخ زوال و سقوط دولت روم کے باب ۳۳ میں "سات سونے والوں" (Seven Sleepers) کے عنوان کے تحت اِن ماخذ سے اس قصّے کا جو خلاصہ دیا ہے وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحاب کہف غار میں پناہ گزین ہوئے تھے، ہمارے مفسرین اس کا نام دقیانوس یا دقیانوس بتاتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈیسیس (Decius) تھا جو ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک روم کا فرمانروا رہا اور جس کا عہد حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر ظلم و ستم کے اعتبار سے مشہور ہے۔ جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسرین اُفسُس یا افسوس لکھتے ہیں، اور گبن اس کا نام اِفِسُس (Ephesus) بتاتا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈر آج موجودہ ٹرکی کی ولایت سمرنا میں پائے جاتے ہیں۔ پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحاب کہف جاگے اس کا نام ہمارے مفسرین تیندوسیس لکھتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس (Theodosius) ثانی کے زمانے میں پیش آیا جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحاب کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا اُس کا نام ہمارے مفسرین یملیخا بتاتے ہیں اور گبن اسے یملیخُس (Jamblichus) لکھتا ہے۔ قصے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈیسیس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر سخت ظلم و ستم ہو رہے تھے، یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے۔ پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال (یعنی تقریباً ۴۴۵ء یا ۴۴۶ء میں) یہ لوگ بیدار ہوئے جبکہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اس حساب سے غار میں ان کے رہنے کی مدت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔

اس سریانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں جن کو بنیاد بنا کر گبن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر "جہالت" کا الزام لگایا ہے، حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر وہ اتنی بڑی جسارت (باقی ص۱۸ پر)

ؔ یہ حاشیہ ص۱۸ پر دیکھیں

جب وہ اُٹھے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ "ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بالکل بیجا بات کریں گے"۔ (پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا) "یہ ہماری قوم تو ربِّ کائنات کو چھوڑ کر دوسرے خدا بنا بیٹھی ہے۔ یہ لوگ اپنے اس عقیدے پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ اب جبکہ تم ان سے اور ان کے معبودانِ غیر اللہ سے بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب فلاں غار میں چل کر پناہ لو۔ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے گا اور تمہارے کام کے لیے سروسامان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) کرتا ہے اس کے متعلق وہ خود مانتا ہے کہ وہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے اور اتنی مدت کے اندر زبانی روایات کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح کی ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بحرف صحیح ہے اور اس سے کسی جز میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے، صرف اُن ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۷) لے یعنی جب وہ سچے دل سے ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا اور ان کو یہ توفیق بخشی کہ حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لینا گوارا کریں، مگر باطل کے آگے سر نہ جھکائیں۔

لے جس زمانے میں ان خدا پرست نوجوانوں کو آبادیوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی تھی اس وقت شہر افسس ایشیائے کوچک میں بُت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں ڈائنا دیوی کا ایک عظیم الشان مندر تھا جس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور دُور دُور سے لوگ اس کی پوجا کے لیے آتے تھے۔ وہاں کے جادوگر، عامل، فال گیر اور تعویذ نویس دنیا بھر میں مشہور تھے۔ شام و فلسطین اور مصر تک ان کا کاروبار چلتا تھا اور اس کاروبار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصہ حصہ تھا جو اپنے فن کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے (ملاحظہ ہو سائیکلوپیڈیا آف بائبلیکل لٹریچر، عنوان Ephesus)۔ شرک اور

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

مہیا کر دے گا۔

تم انہیں غار میں دیکھتے تو تمہیں یوں نظر آتا کہ سورج جب نکلتا ہے تو ان کے غار کو چھوڑ کر دائیں جانب چڑھ جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان سے بچ کر بائیں جانب اتر جاتا ہے اور وہ ہیں کہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ میں پڑے ہیں۔[1] یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مُرشد نہیں پا سکتے۔[2] تم انہیں دیکھ کر یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے۔ ہم انہیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے۔[3] اور ان کا کتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ اگر تم کہیں جھانک کر انہیں دیکھتے تو اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر ان کے نظارے سے دہشت بیٹھ جاتی۔[4] ع

(بقیہ حاشیہ[2]) اوہام پرستی کے اس ماحول میں خدا پرستوں کا جو حال ہو رہا تھا اس کا اندازہ اصحاب کہف کے اس فقرے سے کیا جا سکتا ہے، جو آگے رکوع میں آرہا ہے کہ "اگر ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس ہمیں سنگسار ہی کر ڈالیں گے یا پھر زبردستی اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے"۔

[1] بیچ میں یہ ذکر چھوڑ دیا گیا کہ اس قرار داد باہمی کے مطابق یہ لوگ شہر سے نکل کر پہاڑوں کے درمیان ایک غار میں جا چھپے تاکہ سنگسار ہونے یا مجبوراً مرتد ہو جانے سے بچ سکیں۔

[2] یعنی ان کے غار کا دہانہ شمال کے رُخ تھا جس کی وجہ سے سورج کی روشنی کسی موسم میں بھی اندر نہ پہنچتی تھی اور باہر سے گزرنے والا یہ نہ دیکھ سکتا تھا کہ اندر کون ہے۔

[3] یعنی اگر باہر سے کوئی جھانک کر دیکھتا بھی تو ان سات آدمیوں کے وقتاً فوقتاً کروٹیں لیتے رہنے کی وجہ سے وہ یہی گمان کرتا کہ یہ بس یونہی لیٹے ہوئے ہیں، سوئے ہوئے نہیں ہیں۔

[4] یعنی پہاڑوں کے اندر ایک اندھیرے غار میں چند آدمیوں کا اس طرح موجود ہونا اور آگے کتے کا بیٹھا ہونا ایک ایسا دہشتناک منظر پیش کرتا کہ جھانکنے والے ان کو ڈاکو سمجھ کر بھاگ جاتے تھے، اور یہ ایک بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کے حال پر اتنی مدت تک پردہ پڑا رہا کسی کو یہ جرأت ہی نہ ہوئی کہ اندر جا کر کبھی اصل معاملے سے باخبر ہوتا۔

اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انھیں اٹھا بٹھایا[1] تاکہ ذرا آپس میں پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ کہو، کتنی دیر اس حال میں رہے؟ دوسروں نے کہا۔ شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہونگے۔ پھر وہ بولے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ چلو، اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔ وہاں سے وہ کچھ کھانے کے لیے لائے۔ اور چاہیے کہ ذرا ہوشیاری سے کام کرے تاکہ کسی کو ہمارے یہاں ہونے کا پتہ نہ چل جائے۔ اگر کہیں ان لوگوں کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالیں گے، یا پھر زبردستی ہمیں اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے، اور ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔ —— اس طرح ہم نے اہل شہر کو ان کے حال پر مطلع کر دیا[2] تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بےشک

---

[1] یعنی جیسے عجیب طریقے سے وہ سلائے گئے تھے اور دنیا کو ان کے حال سے بے خبر رکھا گیا تھا، ویسا ہی عجیب کرشمۂ قدرت ان کا ایک طویل مدت کے بعد جاگنا بھی تھا۔

[2] یعنی جب وہ شخص کھانا خریدنے کے لیے شہر گیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ بت پرست روم کو عیسائی ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی۔ زبان، تہذیب، تمدن، لباس، ہر چیز میں نمایاں فرق آگیا تھا۔ دو سو برس پہلے کا یہ آدمی اپنی سج دھج، لباس، زبان ہر چیز کے اعتبار سے فوراً ایک تماشا بن گیا۔ اور جب اس نے قیصر ڈیسیس کے وقت کا سکہ کھانا خریدنے کے لیے پیش کیا تو دوکاندار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سریانی روایت کی رو سے دوکاندار کو اس پر شبہ یہ ہوا کہ شاید یہ کسی پرانے زمانے کا دفینہ نکال لایا ہے۔ چنانچہ اس نے آس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا اور آخر کار اس شخص کو حکام کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں جا کر یہ معاملہ کھلا کہ یہ شخص تو ان پیروانِ مسیح میں سے ہے جو دو سو برس پہلے اپنا ایمان بچانے کے لیے بھاگ نکلے تھے۔ یہ خبر آناً فاناً شہر کی عیسائی آبادی میں پھیل گئی اور حکام کے ساتھ لوگوں کا ایک ہجوم غار پر پہنچ گیا۔ اب جو اصحاب کہف خبردار ہوئے کہ وہ دو سو برس بعد سو کر اٹھے ہیں تو وہ اپنے عیسائی بھائیوں کو سلام کر کے لیٹ گئے اور ان کی روح پرواز کر گئی۔

آکر رہے گی[1]۔ (مگر ذرا خیال کرو کہ جب سوچنے کی اصل بات یہ تھی) اس وقت وہ آپس میں اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ ان (اصحاب کہف) کے ساتھ کیا کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا "اِن پر ایک دیوار چُن دو، اِن کا رب ہی اِن کے معاملہ کو بہتر جانتا ہے[2]"۔ مگر جو لوگ اُن کے معاملات پر غالب تھے[3] انہوں نے کہا "ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ

---

[1] سُریانی روایت کے مطابق اس زمانے میں وہاں قیامت اور عالم آخرت کے مسئلے پر زور شور کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اگرچہ رومی سلطنت کے اثر سے عام لوگ مسیحیت قبول کر چکے تھے جس کے بنیادی عقائد میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل تھا، لیکن ابھی تک رومی شرک و بت پرستی اور یونانی فلسفے کے اثرات کافی طاقت ور تھے جن کی بدولت بہت سے لوگ آخرت سے انکار، یا کم از کم اس کے ہونے میں شک کرتے تھے۔ پھر اس شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی وہ یہ تھی کہ افسس میں یہودیوں کی بڑی آبادی تھی اور ان میں سے ایک فرقہ (جسے صدوقی کہا جاتا تھا) آخرت کا کھلا منکر تھا۔ یہ گروہ کتاب اللہ (یعنی توراۃ) سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا اور مسیحی علماء کے پاس اُس کے مقابلے میں مضبوط دلائل موجود نہ تھے۔ متی، مرقس اور لوقا، تینوں انجیلوں میں صدوقیوں اور مسیح علیہ السلام کے اُس مناظرے کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو آخرت کے مسئلے پر ہوا تھا، مگر تینوں نے مسیح علیہ السلام کی طرف سے ایسا کمزور جواب نقل کیا ہے جس کی کمزوری کو خود علمائے مسیحیت بھی تسلیم کرتے ہیں (ملاحظہ ہو متی باب ۲۲۔ آیت ۲۳-۳۳۔ مرقس باب ۱۲۔ آیت ۱۸-۲۷۔ لوقا باب ۲۰۔ آیت ۲۷-۴۰)۔ اسی وجہ سے منکرینِ آخرت کا پلّہ بھاری ہو رہا تھا اور مومنینِ آخرت بھی شک و تذبذب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ عین اس وقت اصحاب کہف کے بعث کا یہ واقعہ پیش آیا اور اس نے بعث بعد الموت کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت بہم پہنچا دیا۔

[2] فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صالحینِ نصاریٰ کا قول تھا۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ اصحاب کہف جس طرح غار میں لیٹے ہوئے ہیں اسی طرح انہیں لیٹا رہنے دو اور غار کے دہانے کو تیغا لگا دو، ان کا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کس مرتبے کے ہیں اور کس جزا کے مستحق ہیں۔

[3] اس سے مراد رومی سلطنت کے اربابِ اقتدار اور مسیحی کلیسا کے مذہبی پیشوا ہیں (باقی ص ۲۱ پر)

بنائیں گے۔[1]

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰) جن کے مقابلے میں صالح العقیدہ عیسائیوں کی بات نہ چلتی تھی۔ پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا، بزرگوں کے آستانے پوجے جا رہے تھے، اور مسیح، مریم اور حواریوں کے مجسمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے بعث سے چند ہی سال پہلے ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی افسس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی جس میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور حضرت مریم کے "مادرِ خدا" ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓی اَمْرِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروانِ مسیح کے مقابلے میں اُس وقت عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہ کار بنے ہوئے تھے اور مذہبی و سیاسی امور کی باگیں جن کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی لوگ دراصل شرک کے علم بردار تھے اور انہوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔

[1] مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل اُلٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھیرا کر مقابرِ صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن ان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی اسے انہوں نے ارتکابِ شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اس کی نہی میں موجود ہیں:

لعن اللہ تعالٰی زائرات القبور و المتخذین علیھا المساجد والسرج (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)	اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔
الا وان من کان قبلکم کانوا یتخذون	خبردار رہو، تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء کی قبروں کو

(باقی ص ۲۲ پر)

کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا اُن کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا[۲۲]۔ کہو، میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے

(بقیہ حاشیہ ۲۲) قبور انبیاءھم مساجد	عبادت گاہ بنا لیتے تھے۔ میں تمہیں اس حرکت سے
فانی انہاکم عن ذالک (مسلم)	منع کرتا ہوں۔
لعن اللہ تعالیٰ الیہود والنصاریٰ اتخذوا	اللہ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر، انہوں نے اپنے
قبور انبیاءھم مساجد (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)	انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔
ان اولٰئک اذا کان فیہم الرجل الصالح	ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مرد صالح
فمات بنوا علیٰ قبرہ مسجدا وصوروا فیہ تلک	ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے
الصور اولٰئک شرار الخلق یوم القیٰمۃ۔	اور اس کی تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ قیامت کے
(احمد، بخاری، مسلم، نسائی)	روز بدترین مخلوقات ہوں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن تصریحات کی موجودگی میں کون خدا ترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایۃً ذکر کیا گیا ہے اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل و حجت ٹھیرائے؟

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ ۱۸۴۱ء میں ریورنڈ ٹی ارنڈیل (Arundell) نے "ایشیائے کوچک کے اکتشافات" (Discoveries in Asia Minor) کے نام سے اپنے جو مشاہدات شائع کیے تھے ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر افسس کے کھنڈرات سے متصل ایک پہاڑی پر اس نے حضرت مریم اور سات لڑکوں (یعنی اصحاب کہف) کے مقبروں کے آثار پائے ہیں۔

[۲۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے پونے تین سو سال بعد، نزولِ قرآن کے زمانے میں اس کی تفصیلات کے متعلق مختلف افسانے عیسائیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور عموماً مستند معلومات لوگوں کے پاس موجود نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پریس کا زمانہ نہ تھا کہ جن کتابوں میں اس کے متعلق نسبتہً زیادہ (باقی ص۲۳ پر)

معاملے میں رُشد سے قریب تر بات کی طرف میری رہنمائی فرما دیگا[۲۴] ـــــ اور وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور (کچھ لوگ مدت کے شمار میں) ۹ سال اور بڑھ گئے ہیں[۲۵] - تم کہو، اللہ

(بقیہ حاشیہ ۲۳) اس قصے سے لینے چاہئیں اور اس میں توجہ کے قابل یہی امور ہیں۔ ان سے توجہ ہٹا کر اس کھوج میں لگ جانا کہ اصحاب کہف کتنے تھے اور کتنے نہ تھے، اور ان کے نام کیا کیا تھے، اور ان کا کتا کس رنگ کا تھا، یہ اُن لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر صرف چھلکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی کہ اگر دوسرے لوگ اس طرح کی غیر متعلق بحثیں چھیڑیں بھی تو تم ان میں نہ الجھو، نہ ایسے سوالات کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرو بلکہ اپنی توجہ صرف کام کی بات پر مرکوز رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی صحیح تعداد بیان نہیں فرمائی تاکہ شوقِ فضول رکھنے والوں کو غذا نہ ملے۔

[۲۴] یہ ایک جملۂ معترضہ ہے جو پچھلی آیت کے مضمون کی مناسبت سے سلسلۂ کلام کے بیچ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ پچھلی آیت میں ہدایت کی گئی تھی کہ اصحاب کہف کی تعداد کا صحیح علم اللہ کو ہے اور اس کی تحقیق کرنا ایک غیر ضروری کام ہے، لہٰذا خواہ مخواہ ایک غیر ضروری بات کی کھوج میں لگنے سے پرہیز کرو، اور اس پر کسی سے بحث بھی نہ کرو۔ اس سلسلہ میں آگے کی بات ارشاد فرمانے سے پہلے جملۂ معترضہ کے طور پر ایک اور ہدایت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو دی گئی اور وہ یہ کہ تم کبھی دعوے سے یہ نہ کہہ دینا کہ میں کل فلاں کام کر دوں گا۔ تم کو کیا خبر کہ تم وہ کام کر سکو گے یا نہیں۔ نہ تمہیں غیب کا علم اور نہ اپنے افعال میں ایسے خود مختار کہ جو کچھ چاہو کر سکو۔ اس لیے اگر کبھی بے خیالی میں ایسی بات زبان سے نکل بھی جائے تو فوراً متنبہ ہو کر اللہ کو یاد کرو اور ان شاء اللہ کہہ دیا کرو۔ مزید برآں تم یہ بھی نہیں جانتے کہ جس کام کے کرنے کو تم کہہ رہے ہو، آیا اس میں خیر ہے یا کوئی دوسرا کام اس سے بہتر ہے۔ لہٰذا اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے یوں کہا کرو کہ امید ہے میرا رب اس معاملے میں صحیح بات، یا صحیح طرزِ عمل کی طرف میری رہنمائی فرما دیگا۔

[۲۵] اس فقرے کا تعلق ہمارے نزدیک جملۂ معترضہ سے پہلے کے فقرے کے ساتھ ہے یعنی سلسلۂ عبارت یوں ہے کہ "کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا ...... اور کچھ (باقی صفحہ ۲۵)

ان کے قیام کی مدت زیادہ جانتا ہے، آسمانوں اور زمین کے سب پوشیدہ احوال اسی کو معلوم ہیں کیا خوب ہے وہ دیکھنے والا اور سننے والا! زمین و آسمان کی مخلوقات کا کوئی خبر گیر اس کے سوا نہیں، اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اے نبی، تمہارے رب کی کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اسے (جوں کا توں) سنا دو کوئی اس کے فرمودات کو بدل دینے کا مجاز نہیں ہے، (اور اگر تم کسی کی خاطر اس میں ردو بدل کر دو گے تو) اس سے بچ کر بھاگنے کے لیے کوئی جائے پناہ نہ پاؤ گے۔[۲] اور اپنے دل کو

(بقیہ حاشیہ ۲۴) لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور بعض لوگ اس مدت کے شمار میں نو سال اور بڑھ گئے ہیں"۔ اس عبارت میں ۳ سو اور تین سو نو سال کی تعداد جو بیان کی گئی ہے جملہ خیال ہیں یہ دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ تم کہو، اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے۔ اگر ۳۰۹ کی تعداد اللہ نے خود بیان فرمائی ہوتی، تو اس کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی یہی تاویل اختیار فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے بلکہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے۔

[۱] اصحاب کہف کا قصہ ختم کرنے کے بعد اب یہاں سے دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے اور اس میں اُن حالات پر تبصرہ ہے جو اس وقت مکہ میں مسلمانوں کو درپیش تھے۔

[۲] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفار مکہ کی خاطر قرآن میں کچھ ردو بدل کر دینے اور سرداران قریش سے کچھ کم و بیش پر مصالحت کر لینے کی سوچ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے منع فرما رہا تھا۔ بلکہ دراصل اس میں روئے سخن کفار مکہ کی طرف ہے اگرچہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مقصود کفار کو یہ بتانا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا بیشی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ان کا کام بس یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اسے بے کم و کاست پہنچا دیں۔ تمہیں ماننا ہے تو اس پورے دین کو جوں کا توں مانو جو خداوند عالم کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور نہیں ماننا تو شوق سے نہ مانو۔ مگر یہ امید کسی حال میں نہ رکھو کہ تمہیں راضی کرنے کے لیے اس دین (باقی صفحہ ۲۶ پر)

اُن لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں، اور اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ ۝ کسی ایسے شخص کی اطاعت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) دین میں تمہاری خواہشات کے مطابق کوئی ترمیم کی جائے گی، خواہ وہ کیسی ہی جزوی سی ترمیم ہو۔ یہ جواب ہے اُس مطالبے کا جو کفار کی طرف سے بار بار کیا جاتا تھا کہ ایسی بھی کیا ضد ہے کہ ہم تمہاری پوری بات مان لیں۔ آخر کچھ تو ہمارے آبائی دین کے عقائد اور رسم و رواج کی رعایت ملحوظ رکھو۔ کچھ تم ہماری مان لو، کچھ ہم تمہاری مان لیں۔ اس پر سمجھوتہ ہو سکتا ہے اور برادری پھوٹ سے بچ سکتی ہے۔ قرآن میں ان کے اس مطالبے کا متعدد مواقع پر ذکر کیا گیا ہے اور اس کا یہی جواب دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ یونس کی یہ آیت ملاحظہ ہو: وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۔ "جب ہماری آیات صاف صاف ان کو سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو کبھی ہمارے سامنے حاضر ہونے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔" (رکوع ۲)

۵۱ ابنِ عباس کی روایت کے مطابق، قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صہیبؓ اور عمارؓ اور خبابؓ اور ابن مسعودؓ جیسے غریب لوگ، جو تمہاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں، ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تمہاری مجلس میں آسکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جو لوگ رضائے الٰہی کی خاطر تمہارے گرد جمع ہوئے ہیں اور شب و روز اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، ان کی معیت پر اپنے دل کو مطمئن کرو اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم ان مخلص لوگوں کو چھوڑ کر یہ چاہتے ہو کہ دنیوی ٹھاٹھ باٹھ رکھنے والے لوگ تمہارے پاس بیٹھیں؟ اس فقرے میں بھی بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر سنانا دراصل سردارانِ قریش کو مقصود ہے کہ تمہاری یہ دکھاوے کی شان و شوکت، جس پر تم پھول رہے ہو، اللہ اور اس کے رسول کی نگاہ میں کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ تم سے وہ غریب لوگ زیادہ قیمتی ہیں جن کے دل میں اخلاص ہے اور جو اپنے رب کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہتے۔ ٹھیک یہی معاملہ حضرت نوح اور ان کی قوم کے سرداروں کے درمیان بھی پیش آیا تھا۔ وہ حضرت نوح سے کہتے تھے وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ ۔ "ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے جو (باقی صفحہ ۲۷ پر)

نہ کرو [۱] جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کرلی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے [۲]۔ صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے، اور جس کا جی چاہے انکار کر دے [۳]۔ ہم نے (انکار کرنے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶) جو رذیل لوگ ہیں وہ بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں"۔ اور حضرت نوحؑ کا جواب یہ تھا کہ مَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا "میں ایمان لانے والوں کو دھتکار نہیں سکتا"۔ اور وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا "جن لوگوں کو تم حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو، میں ان کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے انہیں کوئی بھلائی عطا نہیں کی ہے"۔ (ہود۔ رکوع ۳)

[۱] یعنی اس کی بات نہ مانو۔ اس کے آگے نہ جھکو، اس کا منشا پورا نہ کرو اور اس کے کہے پر نہ چلو۔

[۲] كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا کا ایک مطلب تو وہ ہے جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ "جو حق کو پیچھے چھوڑ کر اور اخلاقی حدود کو توڑ کر بگٹٹ چلنے والا ہے"۔ دونوں صورتوں میں حاصل ایک ہی ہے۔ جو شخص خدا کو بھول کر اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے اس کے ہر کام میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حدود نا آشنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے آدمی کی اطاعت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت کرنے والا خود بھی حدود نا آشنا ہو جائے اور جس جس وادی میں مطاع بھٹکے اسی میں مطیع بھی بھٹکتا چلا جائے۔

[۳] یہاں پہنچ کر صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ اصحاب کہف کا قصہ سنانے کے بعد یہ فقرے کس مناسبت سے ارشاد ہوئے ہیں۔ اصحاب کہف کے جو واقعات اوپر بیان ہوئے ہیں ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ توحید پر ایمان لانے کے بعد انہوں نے کس طرح اٹھ کر دو ٹوک بات کہدی کہ "ہمارا رب تو بس وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے"، اور پھر کس طرح وہ اپنی گمراہ قوم سے کسی قسم کی مصالحت پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ انہوں نے پورے عزم کے ساتھ کہا کہ "ہم اس کے سوا کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکاریں گے، اگر ہم ایسا کریں تو بڑی بے جا بات کریں گے"۔ اور کس طرح انہوں نے اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ کر بغیر کسی سہارے اور بغیر کسی سروسامان کے ایک غار میں جا پڑنا قبول کر لیا، مگر یہ گوارا نہ کیا کہ حق سے بال برابر بھی ہٹ کر اپنی قوم سے مصالحت کر لیتے پھر جب وہ بیدار ہوئے تب بھی انہیں فکر ہوئی تو اس بات کی کہ اگر خدانخواستہ ہماری قوم ربانی (بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

والے ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں۔[1] وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا[2] اور ان کا منہ بھون ڈالیگا، بدترین پینے کی چیز اور بہت بری آرام گاہ! رہے وہ لوگ جو مان لیں اور نیک عمل کریں، تو یقیناً ہم نیکوکار لوگوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔ اُن کے لیے

(بقیہ حاشیہ ۲) ہم کو اپنی ملت کی طرف پھیرے جانے میں کامیاب ہو گئی تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔ ان واقعات کا ذکر کرنے کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے ——— اور سنانا دراصل مخالفین اسلام کو مقصود ہے ——— کہ ان مشرکین اور منکرینِ حق سے مصالحت قطعاً خارج از بحث ہے۔ جو حق خدا کی طرف سے آیا ہے اسے بے کم و کاست ان کے سامنے پیش کر دو۔ مانتے ہیں تو مانیں، نہیں مانتے تو خود بُرا انجام دیکھیں گے۔ جنہوں نے مان لیا ہے، خواہ وہ کم سن نوجوان ہوں، یا بے مال و زر فقیر، یا غلام اور مزدور، بہرحال وہی قیمتی جواہر ہیں، انہی کو یہاں عزیز رکھا جائے گا اور ان کو چھوڑ کر ان بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں کی کچھ پروا نہ کی جائے گی جو دنیا کی شان و شوکت خواہ کتنی ہی رکھتے ہوں مگر ہیں خدا سے غافل اور اپنے نفس کے بندے۔

[1] سرادق کے اصل معنی ہیں قناتیں اور سراپردے جو کسی خیمہ گاہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ لیکن جہنم کی مناسبت سے دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ سرادق سے مراد اس کے وہ بیرونی حدود ہیں جہاں تک اس کی لپٹیں پہنچیں اور اس کی حرارت کا اثر ہو۔ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "اس کے سرادق نے ان کو گھیرے میں لے لیا ہے"۔ بعض لوگوں نے اس کو مستقبل کے معنی میں لیا ہے، یعنی وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عالمِ آخرت میں جہنم کے سراپردے ان کو گھیر لیں گے۔ لیکن ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق سے منہ موڑنے والے ظالم یہیں سے جہنم کی لپیٹ میں آچکے ہیں اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

[2] لغت میں "مُہل" کے مختلف معنی بیان کیے گئے ہیں۔ بعض اس کے معنی "تیل کی تلچھٹ" بتاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ "لاوے" کے معنی میں آتا ہے، یعنی زمین کے وہ مادے جو شدتِ حرارت سے پگھل گئے ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد پگھلی ہوئی دھات ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی پیپ اور لہو کے ہیں۔

والے ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں[1]۔
وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے ان کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا[2]
اور ان کا منہ بھون ڈالیگا، بدترین پینے کی چیز اور بہت بُری آرام گاہ! رہے وہ لوگ جو
مان لیں اور نیک عمل کریں، تو یقیناً ہم نیکوکار لوگوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔ اُن کے لیے

(بقیہ حاشیہ ۳۲) ہم کو اپنی ملت کی طرف پھیرے جانے میں کامیاب ہوگئے تو ہم کبھی فلاح نہ پاسکیں گے۔ ان واقعات کا ذکر کرنے کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا جارہا ہے ——— اور سنانا دراصل مخالفین اسلام کو مقصود ہے ——— کہ ان مشرکین اور منکرین حق سے مصالحت قطعاً خارج از بحث ہے۔ جو حق خدا کی طرف سے آیا ہے اسے بے کم وکاست ان کے سامنے پیش کردو۔ مانتے ہیں تو مانیں، نہیں مانتے تو خود بُرا انجام دیکھیں گے جنہوں نے مان لیا ہے، خواہ وہ کم سن نوجوان ہوں، یا بے مال و زر فقیر، یا غلام اور مزدور، بہرحال وہی قیمتی جواہر ہیں، انہی کو یہاں عزیز رکھا جائے گا اور ان کو چھوڑ کر ان بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں کی کچھ پروا نہ کی جائے گی جو دنیا کی شان وشوکت خواہ کتنی ہی رکھتے ہوں مگر ہیں خدا سے غافل اور اپنے نفس کے بندے۔

[1] سرادق کے اصل معنی ہیں قناتیں اور سراپردے جو کسی خیمہ گاہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ لیکن جہنم کی مناسبت سے دیکھا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ سرادق سے مراد اس کے وہ بیرونی حدود ہیں جہاں تک اس کی لپٹیں پہنچیں اور اس کی حرارت کا اثر ہو۔ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "اس کے سرادق نے ان کو گھیرے میں لے لیا ہے"۔ بعض لوگوں نے اس کو مستقبل کے معنی میں لیا ہے، یعنی وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عالم آخرت میں جہنم کے سراپردے ان کو گھیر لیں گے۔ لیکن ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق سے مُنہ موڑنے والے ظالم ابھی سے جہنم کی لپیٹ میں آچکے ہیں اور اس سے بچ کر بھاگ نکلنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

[2] لغت میں "مُہل" کے مختلف معنی بیان کیے گئے ہیں۔ بعض اس کے معنی "تیل کی تلچھٹ" بتاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ "لاوے" کے معنی میں آتا ہے یعنی زمین کے وہ مادے جو شدت حرارت سے پگھل گئے ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد پگھلی ہوئی دھات ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی پیپ اور لہو کے ہیں۔

سدا بہار جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی، وہاں وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ کیے جائیں گے[1] باریک ریشم اور اطلس و دیبا کے سبز کپڑے پہنیں گے، اور اونچی مسندوں[2] پر تکیے لگا کر بیٹھیں گے بہترین اجر اور اعلیٰ درجے کی جائے قیام! ع

اے محمدؐ، ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو[3]۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور اُن کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بار آور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی۔ ان باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی اور اُسے خوب نفع حاصل ہوا۔ یہ کچھ پا کر ایک دن وہ اپنے ہمسائے سے بات کہتے ہوئے بولا میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقتور نفری رکھتا ہوں۔ پھر وہ اپنی جنت میں داخل ہوا[4] اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی، اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی تاہم

---

[1] قدیم زمانے میں بادشاہ سونے کے کنگن پہنتے تھے۔ اہل جنت کے لباس میں اس چیز کا ذکر کرنے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ وہاں اُن کو شاہانہ لباس پہنائے جائیں گے۔ ایک کافر و فاسق بادشاہ وہاں ذلیل و خوار ہوگا اور ایک مومن و صالح مزدور وہاں بادشاہوں کی سی شان و شوکت سے رہیگا۔

[2] ارائک جمع ہے اریکہ کی۔ اریکہ عربی زبان میں ایسے تخت کو کہتے ہیں جس پر چتر لگا ہوا ہو۔ اس سے بھی یہی تصور دلانا مقصود ہے کہ وہاں ہر جنتی تخت شاہی پر متمکن ہوگا۔

[3] اس مثال کی مناسبت سمجھنے کے لیے پچھلے رکوع کی وہ آیت نگاہ میں رہنی چاہیے جس میں مکے کے متکبر سرداروں کی اس بات کا جواب دیا گیا تھا کہ ہم غریب مسلمانوں کے ساتھ آ کر نہیں بیٹھ سکتے، انہیں ہٹا دیا جائے تو ہم آ کر سنیں گے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔

[4] یعنی جن باغوں کو وہ اپنی جنت سمجھ رہا تھا۔ کم ظرف لوگ جنہیں دنیا میں کچھ شان و شوکت حاصل ہو جاتی ہے ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں دنیا ہی میں جنت نصیب ہو چکی ہے، اب اور کونسی جنت ہے جسے حاصل کرنے کی وہ فکر کریں۔

ہُوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر اُلٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ "کاش میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہوتا" ------ نہ ہُوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا، اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اِس آفت کا مقابلہ ------ اُس وقت معلوم ہُوا کہ کارسازی کا اختیار خدائے برحق ہی کے لیے ہے، انعام وہی بہتر ہے جو وہ بخشے اور انجام وہی بخیر ہے جو وہ دکھائے ؏ ۵

اور اے نبی، انہیں حیاتِ دنیا کی حقیقت اِس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کی پَود خوب گھنی ہوگئی، اور کل وہی نباتات بھُس بن کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[1]۔ یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ فکر اُس دن کی ہونی چاہیے جب کہ ہم پہاڑوں کو چلائیں گے[2]، اور تم زمین کو بالکل برہنہ پاؤ گے[3]، اور ہم تمام

---

[1] یعنی وہ زندگی بھی بخشتا ہے اور موت بھی۔ وہ عروج بھی عطا کرتا ہے اور زوال بھی۔ اُس کے حکم سے بہار آتی ہے تو خزاں بھی آجاتی ہے۔ اگر آج تمہیں عیش اور خوشحالی میسر ہے تو اس غرّے میں نہ رہو کہ یہ حالت لازوال ہے۔ جس خدا کے حکم سے یہ کچھ تمہیں ملا ہے اسی کے حکم سے سب کچھ تم سے چھِن بھی سکتا ہے۔

[2] یعنی جبکہ زمین کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور پہاڑ اس طرح چلنے شروع ہونگے جیسے بادل چلتے ہیں۔ اس کیفیت کو ایک دوسرے مقام پر قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (النمل۔ رکوع ۷) "تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ سخت جمے ہوئے ہیں، مگر وہ چلیں گے اِس طرح جیسے بادل چلتے ہیں"

[3] یعنی اس پر کوئی روئیدگی اور کوئی عمارت باقی نہ رہے گی، بالکل ایک چٹیل میدان بن جائے گی۔ یہ وہی بات ہے جو اِس سورے کے آغاز میں ارشاد ہوئی تھی کہ "جو کچھ اس زمین پر ہے اسے ہم نے لوگوں کی آزمائش کے لیے ایک عارضی آرائش بنایا ہے، ایک وقت آئے گا جب یہ بالکل ایک بے آب و گیاہ صحرا بن کر رہ جائیگی"

انسانوں کو اس طرح گھیر کر جمع کریں گے کہ (اگلوں پچھلوں میں سے) ایک بھی نہ چھوٹے گا[1]۔ اور سب کے سب تمہارے رب کے حضور صف در صف پیش کیے جائیں گے —— لو دیکھو، آ گئے نا تم ہمارے پاس اسی طرح جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا[2]۔ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا ہے —— اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتاب زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی، یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہو گئی ہو۔ جو جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا[3]۔ ع ع

---

[1] یعنی ہر انسان جو آدم سے لیکر قیامت کی آخری ساعت تک پیدا ہوا ہے، خواہ ماں کے پیٹ سے نکل کر اس نے ایک ہی سانس لیا ہو، اس وقت دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور سب کو ایک وقت میں جمع کر دیا جائے گا۔

[2] یعنی اس وقت منکرین آخرت سے کہا جائے گا کہ دیکھو، انبیاء کی دی ہوئی خبر سچی ثابت ہوئی نا۔ وہ تمہیں بتاتے تھے کہ جس طرح اللہ نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے اسی طرح دوبارہ پیدا کرے گا، مگر تم اسے ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بتاؤ، اب دوبارہ تم پیدا ہو گئے یا نہیں؟

[3] یعنی ایسا ہرگز نہ ہو گا کہ کسی نے کوئی جرم نہ کیا ہو اور وہ خواہ مخواہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جائے، اور نہ یہی ہو گا کہ آدمی کو اس کے جرم سے بڑھ کر سزا دی جائے یا بے گناہ پکڑ کر سزا دے ڈالی جائے۔

اسلامی دستور کی بنیادیں

از روئے قرآن و سنت

اس وقت جبکہ ملک کے دستور کی ترتیب آخری مراحل میں ہے، اہل علم کا فرض ہے کہ دستور ساز اسمبلی کو ایک صحیح اسلامی دستور مرتب کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دیں۔ جماعت اسلامی اس سلسلہ میں اپنی حد استطاعت تک جو کچھ خدمت انجام دے سکتی تھی دیتی رہی ہے۔ ۱۹۵۱ء کے آغاز میں تمام مسلم فرقوں کے نمائندہ علماء نے بھی اسلامی ریاست کے ۲۲ بنیادی اصول بالاتفاق مرتب کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ مگر کچھ لوگ برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ایک طرف مسلم عوام اور تعلیم یافتہ لوگوں کو، اور دوسری طرف دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو زیادہ سے زیادہ غلط فہمیوں میں مبتلا کریں۔ چنانچہ ان کی طرف سے بار بار یہ خیال مختلف الفاظ میں دُہرایا جا رہا ہے کہ قرآن میں دستور کے لیے کوئی رہنمائی نہیں کی گئی ہے، اور اسلام کسی خاص طرز کی حکومت کا تقاضا نہیں کرتا، اور "اسلامی دستور" سرے سے کسی چیز کا نام ہی نہیں ہے۔ ان گمراہ کن باتوں کے پیچھے دلائل کچھ بھی نہیں ہیں، مگر زوال علم کے اس دور میں ذہنی پراگندگی پیدا کرنے کے لیے یہ شور و شغب اچھا خاصا موثر ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایک مختصر مضمون میں کتاب و سنت کی اُن تمام تصریحات کو جمع کر دیا جائے جو دستوری احکام پر مشتمل ہیں، تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آج تک علماء جن اصولوں کو اسلام کے دستوری اصولوں کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں ان کے اصل ماخذ کیا ہیں، اور اس کے ساتھ دستور ساز اسمبلی کے ارکان پر بھی خدا کی حجت تمام ہو جائے اور وہ یہ عذر کبھی پیش نہ کر سکیں کہ ہمیں خدا اور رسولؐ کے احکام بتلائے نہیں گئے تھے۔

یہ مضمون اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لکھا جا رہا ہے۔ اس میں ہم نمبروار ایک ایک دستوری

مسئلے کے متعلق آیاتِ قرآنی اور احادیث صحیحہ درج کریں گے اور پھر ساتھ ساتھ یہ بھی بتلاتے جائیں گے کہ ان سے کیا احکام نکلتے ہیں۔

(۱)

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (یوسف ۵)
حکم نہیں ہے مگر صرف اللہ کے لیے، اس کا فرمان ہے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اس کی، یہی صحیح دین ہے۔

یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ فیصلہ کرنے کا اختیار اور فرماں روائی کا حق (یا بالفاظ دیگر "حاکمیت") اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی لفظی یا قرینہ ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس حاکمیت کو محض "کائناتی حاکمیت" (Universal Sovereignty) کے مفہوم میں مقید کر دیا جائے۔ اللہ کی یہ حاکمیت جس طرح کائناتی ہے اسی طرح سیاسی و قانونی بھی ہے اور اخلاقی و اعتقادی بھی۔ اور خود قرآن مجید میں ان تمام اقسام کی حاکمیتوں کے اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہونے کی واضح دلیلیں موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن تصریح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رب الناس اور الٰہ الناس ہی نہیں ہے بلکہ ملک الناس بھی ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ۔
کہو اے محمد کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبود کی

وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ملک کا مالک ہے اور بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ۔ (آل عمران ۳)
کہو، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے

لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (بنی اسرائیل ۱۲)
بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

پھر وہ صاف صاف کہتا ہے کہ امر کا حق صرف اللہ کو ہے اس لیے کہ پیدا کرنے والا وہی ہے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف ۔۷)
خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا۔

ظاہر ہے کہ یہ محض کائناتی حاکمیت نہیں بلکہ صریحاً سیاسی حاکمیت ہے اور اسی بنا پر قرآن قانونی

حاکمیت کو بھی اللہ کے لیے مخصوص کرتا ہے:۔

اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ (اعراف - ۱)

پیروی کرو اس چیز کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور نہ پیروی کرو اسے چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کی۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ۔ (المائدہ - ۷)

اور جو لوگ فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے وہی کافر ہیں۔

اللہ کی سیاسی اور قانونی حاکمیت کا یہ تصور اسلام کے اولین بنیادی اصولوں میں سے ہے اور شروع سے آج تک تمام فقہائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ حکم دینے کا حق اللہ کے لیے خاص ہے۔ چنانچہ علامہ آمدی اصول فقہ کی مشہور کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انہ لا حاکم سوی اللہ ولا حکم الا ما حکم بہ۔

جان لو کہ حاکم اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور حکم بس وہ ہے جو اللہ نے دیا ہے۔

اور شیخ محمد خضری اپنی اصول الفقہ میں اس کو جمیع اہل اسلام کا متفقہ عقیدہ قرار دیتے ہیں:

انَّ الحکم ھو خطاب اللہ، فلا حکمَ الا للہ وھذہ قضیۃ اتفق علیھا المسلمون قاطبۃ۔

درحقیقت "حکم" اللہ کے فرمان کو کہتے ہیں پس حکم دینے کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمان متفق ہیں۔

پس کوئی اسلامی دستور اس کے بغیر نہیں بن سکتا کہ اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی سیاسی اور قانونی حاکمیت کا اقرار کیا جائے اور بالفاظ صریح یہ لکھا جائے کہ یہ ریاست اللہ کی مطیع ہے۔ اس کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتی ہے اور اس کے احکام کو واجب العمل مانتی ہے۔

(۲)

انبیاء علیہم السلام بالعموم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالخصوص اللہ تعالیٰ کی اس سیاسی و قانونی حاکمیت کے مظہر ہیں یعنی اللہ کی اس حاکمیت کا نفاذ انسانوں میں جس واسطے سے ہوتا ہے وہ

واسطہ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے ان کے حکم کی اطاعت اور ان کے طریقے کی پیروی اور ان کے فیصلوں کو بے چون و چرا ماننا ہر اس فرد اور گروہ اور قوم کے لیے لازم ہے جو اللہ کی اس حاکمیت کو تسلیم کرے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء-۱۱)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء-۹)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء-۱۶)

اے محمدؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی میں حکم کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر-۱)

اور جو کچھ رسول تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء-۹)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے اختلاف میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تو فیصلہ دے اس پر اپنے نفس میں تنگی تک نہ محسوس کریں اور سربسر تسلیم کریں۔

یہ ایک اسلامی ریاست کے دستور کی دوسری بنیاد ہے۔ اس میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار کے بعد دوسرا اقرار یہ ہونا چاہیے کہ اس ریاست میں کتاب اللہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ کو بھی ماخذ قانون کی حیثیت حاصل ہوگی اور اس کی انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ میں سے کسی کو بھی سنت کے خلاف احکام دینے، قانون بنانے اور فیصلے کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

(۳)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔
(النور - ۷)

ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کیا ہے کہ وہ ضرور ان کو
زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے
پہلے لوگوں (مومنین صالحین) کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت دو اہم دستوری نکات کی تصریح کرتی ہے۔ اوّل یہ کہ ایک اسلامی ریاست کا صحیح مقام "خلافت" ہے نہ کہ "حاکمیت"۔ دوم یہ کہ ایک اسلامی ریاست میں خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ پوری امتِ مسلمہ اس کی حامل ہوتی ہے جسے اللہ نے آزاد ریاست عطا کی ہو۔

پہلے نکتے کی تشریح یہ ہے کہ حاکمیت اپنی عین حقیقت ہی کے اعتبار سے اس امر کی متقاضی ہے کہ صاحبِ حاکمیت کی اپنی ذات سے خارج کوئی ایسی طاقت نہ ہو جو اس کے اختیارات کو محدود کرتی ہو اور اس کو خود اس کے اپنے بنائے ہوئے قوانین وضوابط کے سوا کچھ اوپر سے مسلط کیے ہوئے قوانین وضوابط کا پابند بناتی ہو۔ اب اگر ایک ریاست پہلے ہی قدم پر یہ مان لے کہ خدا اور رسول کا حکم اس کے لیے بالاتر قانون کی حیثیت رکھتا ہے جس کے خلاف نہ اس کی منتظمہ کام کر سکتی ہے، نہ اس کی مقننہ کوئی قانون بنا سکتی ہے، اور نہ اس کی عدلیہ کوئی فیصلہ کر سکتی ہے، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے مقابلے میں حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہو گئی ہے اور اس نے حکمرانی میں دراصل خدا اور رسول کے ایجنٹ (خلیفہ) کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس صورت میں اس کے لیے صحیح اصطلاح "حاکمیت" نہیں بلکہ "خلافت" ہی ہو سکتی ہے، ورنہ اس حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے لیے حاکمیت کا لفظ استعمال کرنا محض ایک تناقض فی الاصطلاح ہوگا۔ البتہ اگر وہ اپنی خود مختاری کو خدا کے حکم اور رسول کی سنت کے اتباع سے مقید نہ کرے تو بلاشبہ اس کی صحیح پوزیشن "حاکمیت" ہی کی ہوگی، مگر اس صورت میں اس کے لیے "اسلامی ریاست" کی اصطلاح استعمال کرنا تناقض فی الاصطلاح ہوگا۔

دوسرے نکتے کی تشریح یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اس کے تمام مسلم باشندوں کا

بحیثیتِ مجموعی حامل خلافت ہونا وہ اہم اصولی حقیقت ہے جس پر اسلام میں جمہوریت کی بنا رکھی گئی ہے۔
جس طرح غیر اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی حاکمیت (**Popular Sovereignty**) کے اصول پر قائم ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی خلافت (**Popular Vicegerency**) کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اس نظام میں حاکمیت کے بجائے خلافت کی اصطلاح تو اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہاں اقتدار خدا کا عطیہ ہے اور اس عطیے کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن خلافت کا یہ محدود اقتدار، قرآن کی مذکورۂ بالا تصریح کی رُو سے، کسی ایک شخص یا طبقے کو نہیں بلکہ ریاست کے تمام مسلمانوں کو من حیث الجماعت سونپا گیا ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی سے بنے، ان کے مشورے سے کام کرے، اور اسی وقت تک حکمراں رہے جب تک مسلمان اس سے راضی رہیں۔ اسی بنا پر حضرت ابو بکرؓ نے خلیفۃ اللہ کہلانے سے انکار کیا تھا۔ کیونکہ خلافت دراصل امتِ مسلمہ کو سونپی گئی تھی نہ کہ براہ راست اُن کو۔ اُن کی خلافت کی اصل حیثیت یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی مرضی سے اپنے اختیاراتِ خلافت ان کے سپرد کیے تھے۔
اِن دونوں نکات کو ملحوظ رکھ کر اسلامی ریاست کا دستور ایسا بنایا جانا چاہیے جو حاکمیت کے دعوے سے خالی ہو اور جس میں صریح طور پر ریاست کی حیثیت خلافت نمایاں نظر آتی ہو۔

(۴)

اجتماعی خلافت کے مذکورۂ بالا تقاضے کو قرآن اِن الفاظ میں واضح طور پر بیان کرتا ہے:۔
وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوری ۴) اور اُن کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔
اس آیت میں اسلامی نظامِ زندگی کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں تمام اجتماعی امور مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ یہ صرف بیانِ خصوصیت ہی نہیں ہے بلکہ اپنے فحوائے کلام کے لحاظ سے حکم بھی ہے اور اس بنا پر کسی اجتماعی کام کو مشورے کے بغیر انجام دینا ممنوع ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ
قلت یا رسول اللہ الامر ینزل بنا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے بعد کوئی معاملہ

بعدک لم ینزل فیہ قرآن ولم یسمع منک فیہ شیٔ، قال اجمعوا العابدین امتی و اجعلوہ بینکم شوریٰ ولا تقضوا برای واحد۔ (روح المعانی)	ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو؟ فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لیے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

پھر اس شوریٰ کی اصل روح کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:۔

من اشار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ۔ (ابوداؤد)	جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسی بات کا مشورہ دیا جس کے متعلق وہ خود جانتا ہو کہ صحیح بات دوسری ہے، تو اس نے دراصل اس کے ساتھ خیانت کی۔

یہ حکم نہایت وسیع الفاظ میں ہے اور اس میں شوریٰ کی کوئی خاص شکل معین نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام ساری دنیا کے لیے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اگر شوریٰ کا کوئی خاص طریقہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ عالمگیر اور ابدی نہ ہو سکتا۔ شوریٰ براہ راست تمام لوگوں سے ہو، یا لوگوں کے نمائندوں سے؟ نمائندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں یا خواص کے ووٹوں سے؟ انتخاب مملکت کے ہو یا صرف صدر مقام میں؟ انتخاب الیکشن کی صورت میں ہو یا ایسے لوگ لے لیے جائیں جن کی نمائندہ حیثیت معلوم و معروف ہو؟ مجلس شوریٰ یک ایوانی ہو یا دو ایوانی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ایک جواب ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لیے یکساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان کے جواب کی مختلف صورتیں مختلف حالات کے لیے موزوں ہو سکتی ہیں اور حالات کی تبدیلی سے نئی نئی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اس لیے شریعت نے ان امور کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ نہ کسی خاص شکل کا تعین کیا ہے اور نہ کسی خاص شکل کو ممنوع ہی قرار دیا ہے۔ البتہ اصولاً اوپر کی آیت اور اس کی توضیح کرنے والی احادیث میں تین باتیں لازم کر دی گئی ہیں:

(۱) مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام مشورے کے بغیر انجام نہ پانا چاہیے۔ یہ چیز ملوکیت کی جڑ کاٹ دیتی

ہے۔ اس لیے کہ حکومت کے معاملات میں سب سے اہم معاملہ تو خود رئیس حکومت کا تقرر ہے۔ اگر دوسرے معاملات میں مشورہ لازم ہے تو رئیس حکومت کا زبردستی مسلط ہو جانا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ چیز ڈکٹیٹر شپ کو بھی ممنوع ٹھیراتی ہے۔ کیونکہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی استبداد کے ہیں، اور استبداد شوریٰ کی ضد ہے۔ اسی طرح دستور کو عارضی طور پر معطل کرنے کے اختیارات بھی اس حکم کی موجودگی میں رئیس مملکت کو نہیں دیئے جا سکتے، کیونکہ تعطل کے دور میں لامحالہ وہ استبداد سے کام کرے گا اور استبداد ممنوع ہے۔

(۲) معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو ان سب کو مشورے میں شریک ہونا چاہیے، خواہ وہ براہ راست شریک ہوں یا اپنے معتمد علیہ نمائندوں کے واسطے سے شریک ہوں۔

(۳) مشورہ آزادانہ اور بے لاگ اور مخلصانہ ہونا چاہیے۔ دباؤ اور لالچ کے تحت ووٹ یا مشورہ لینا دراصل مشورہ نہ لینے کا ہم معنی ہے۔

پس دستور کی تفصیلات خواہ کچھ ہوں، اس میں شریعت کے یہ تینوں اصول ہر حال ملحوظ رہنے چاہئیں اس میں ایسی کوئی گنجائش نہ رکھی جانی چاہیے کہ کسی وقت بھی عوام سے یا ان کے معتمد علیہ نمائندوں سے مشورہ لیے بغیر حکومت کی جانے لگے۔ اس میں انتخابات کا ایسا نظام تجویز کیا جانا چاہیے جس سے پوری قوم شریک مشورہ ہو سکے۔ اور اس میں ان اسباب کا سدباب ہونا چاہیے جن کے زیر اثر عوام سے یا ان کے نمائندوں سے خوف یا لالچ یا فریب کے تحت رائے لینا ممکن ہو۔

(۵)

رئیس حکومت، وزراء، اہل شوریٰ، اور حکام کے انتخاب میں کیا امور ملحوظ رہنے چاہئیں، اس باب میں قرآن اور سنت کی ہدایات یہ ہیں:۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ۔ (النساء - ۸)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں یعنی اعتماد کی ذمہ داریاں، اہل امانت (یعنی امین لوگوں) کے سپرد کرو۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز

(الحجرات - ۲)

خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم وتصلون علیھم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم (رواہ مسلم)

وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

تمہارے بہترین سردار وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور جن کو تم دعا دو اور وہ تمہیں دعا دیں۔ اور تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں اور جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔

انا واللہ لا نولی علیٰ عملنا ھذا احدا سألہ او حرص علیہ (متفق علیہ)

خدا کی قسم ہم اپنی اس حکومت کے کسی کام پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو اس کی درخواست کرے یا اس کا حریص ہو۔

ان اخونکم عندنا من طلبہ (ابوداؤد)

ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ شخص ہے جو اس کا خود طالب ہو۔

حدیث سے گزر کر یہ بات تاریخ کے صفحات پر بھی ثبت ہو چکی ہے کہ اسلام میں عہدوں کی طلب سخت ناپسندیدہ چیز ہے۔ چنانچہ قلقشندی اپنی کتاب صبح الاعشیٰ میں بیان کرتا ہے:۔

وقد اثر عن ابی بکر انہ قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ھذا الامر فقال لی یا ابا بکر ھو لمن یرغب عنہ لا لمن یجاحش علیہ ولمن یتضاءل عنہ لا لمن یتنفج الیہ۔ ھو لمن یقال ھو لک لا لمن یقول ھو لی (صبح الاعشیٰ للقلقشندی ج ۱- ص ۲۴۰)

حضرت ابوبکر سے ماثور ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امارت کے بارے میں دریافت کیا تو حضور نے جواب دیا اے ابوبکر وہ اُس کے لیے ہے جو اس سے بے رغبت ہو نہ کہ اس کے لیے جو اس پر ٹوٹا پڑتا ہو۔ وہ اس کے لیے ہے جو اس سے بچنے کی کوشش کرے نہ کہ اس کے لیے جو اس پر جھپٹے۔ وہ اس کے لیے ہے جس سے کہا جائے کہ یہ تیرا حق ہے نہ کہ اس کے لیے جو خود کہے کہ یہ

میرا حق ہے[1]۔

یہ ہدایات اگرچہ محض اصولی ہدایات ہیں۔ ان میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ مطلوبہ صفات کے سرداروں اور نمائندوں کو منتخب کرنے، اور ناپسندیدہ لوگوں کو رد کرنے کے لیے مشینری کیا ہو، لیکن بہرحال یہ وقت کے دستور سازوں کا کام ہے کہ ان ہدایات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مناسب عملی تدابیر تجویز کریں انہیں انتخاب کا ایسا نظام سوچنا چاہیے جس سے امین اور متقی اور عوام کے محبوب اور خیرخواہ لوگ منتخب ہوسکیں اور وہ لوگ نہ ابھرنے پائیں جو عوام کے ووٹ لیکر بھی اُن کے مبغوض بنتے ہیں جن پر ہر طرف لعنت کی بوچھاڑ ہوتی ہے جن کے حق میں لوگ بددعائیں کرتے ہیں اور جنہیں عہدے پیش نہیں کیے جاتے بلکہ وہ خود عہدوں پر جھپٹتے ہیں۔

(۶)

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ (النساء۔۴)	مرد عورتوں پر قوام ہیں۔
لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ (بخاری)	وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جو اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کرے۔

یہ دونوں نصوص اس باب میں قاطع ہیں کہ مملکت میں ذمہ داری کے مناصب (خواہ وہ صدارت ہو، یا وزارت، یا مجلسِ شوریٰ کی رکنیت، یا مختلف محکموں کی ادارت) عورتوں کے سپرد نہیں کیے جاسکتے۔ اس لیے کسی اسلامی ریاست کے دستور میں عورتوں کو یہ پوزیشن دینا، یا اس کے لیے گنجائش رکھنا نصوصِ صریحہ کے خلاف ہے اور اطاعتِ خدا و رسول کی پابندی قبول کرنے والی ریاست اس خلاف ورزی کی سرے سے مجاز ہی نہیں ہے[2]۔

---

[1] یہ اثر اگرچہ کسی حدیث کی کتاب میں ہمیں ان الفاظ میں نہیں ملا ہے۔ بلکہ یہ ایک مورخ کا بیان ہے لیکن ہم نے اس بنا پر اسے نقل کر دیا ہے کہ حدیث کی دو مستند روایتیں اسی معنی میں اوپر نقل کی جاچکی ہیں۔ اس طرح کی کمزور روایتیں معنی کے اعتبار سے قوی ہو جاتی ہیں جبکہ ان کی تائید میں صحیح روایات موجود ہوں۔

[2] اس مسئلے کی تشریح ہم ایک مستقل مضمون میں کر چکے ہیں جو ستمبر ۱۹۵۲ء کے ترجمان القرآن میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے یہاں ہم نے اس کے پورے دلائل جمع نہیں کیے ہیں بلکہ صرف حکم بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

(۷)

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ	جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا	کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور
بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج-۶)	بدی سے روکیں گے۔

اس آیت میں اسلامی حکومت کے مقصدِ وجود اور اس کے بنیادی فرائض کا ذکر کیا گیا ہے۔ کافر حکومتوں کی طرح اس کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ ملک کے اندرونی امن اور خارجی سرحدوں کی حفاظت کرے، اور ملک کی مادّی خوشحالی کے لیے ساعی ہو، بلکہ ایک اسلامی حکومت ہونے کی حیثیت سے اس کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے، اور اُن بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں خدا اور رسول بھلائی قرار دیتے ہیں، اور اُن برائیوں کو روکے جنہیں خدا اور رسول برائی کہتے ہیں۔ کوئی ایسی حکومت اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جو اس بات سے بے پروا ہو کہ نماز قائم ہو رہی ہے یا نہیں، زکوٰۃ دی جا رہی ہے یا نہیں، بھلائیاں پھیل رہی ہیں یا مٹ رہی ہیں، اور برائیاں دب رہی ہیں یا ابھر رہی ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام ایسی حکومت کو زیب نہیں دیتا جس کے حدود میں زنا، اور شراب، اور قمار بازی، اور فحش لٹریچر، اور فحش تماشوں، اور فحش گانوں، اور مخلوط تعلیم، اور تبرّجِ جاہلیت، اور اختلاطِ مرد وزن کا عام رواج ہو اور ان صریح منکرات پر کوئی قدغن نہ ہو۔ پس ایک اسلامی دستور میں لازماً ریاست کو اُن فرائض کا پابند ہونا چاہیے جنہیں قرآن اس کے بنیادی فرائض میں شمار کرتا ہے۔

(۸)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ
اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ	کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو
تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ	تم میں سے صاحبِ امر ہوں پھر اگر کسی معاملے میں
الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	تمہارے درمیان نزاع ہو تو اس کو اللہ اور رسول

الاٰخِرِ، ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ (النساء ۔ ۸)

کی طرف پھیرو اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ یہ بہتر ہے اور بلحاظ انجام بھی اچھا ہے۔

اس آیت میں تین نہایت اہم بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک کا گہرا تعلق دستوری مسائل سے ہے:۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت وہ اصل اطاعت ہے جس کا ہر مسلمان فرد کو بحیثیت فرد اور مسلمان قوم کو بحیثیت قوم پابند ہونا چاہیے۔ یہ اطاعت ہر دوسری اطاعت پر مقدم ہے۔ اولی الامر کی اطاعت اس کے بعد ہے نہ کہ اس سے پہلے، اور اس کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد۔ اس نکتے کی مزید وضاحت حسب ذیل آیات اور احادیث میں ہم کو ملتی ہے

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب ۔ ۵)

کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو پھر ان کے لیے خود اپنے اس معاملے میں فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ ۔ ۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ ۔ ۷)

اور جو فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے وہی کافر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہی ظالم ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی فاسق ہیں۔

السمعُ والطاعةُ على المرءِ المسلم فی ما احب وکرہ ما لم یؤمر بمعصیۃ فاذا اُمِر بمعصیۃ فلا سمعَ ولا طاعۃ (بخاری ومسلم)

ایک مسلمان پر سمع وطاعت لازم ہے خواہ برضا ورغبت کرے یا بکراہت تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ پھر جب اس کو معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔

ان امر علیکم عبد مجدع یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا واطیعوا (مسلم)	اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔
لاطاعۃَ فی معصیۃٍ انما الطاعۃُ فی المعروفِ (بخاری و مسلم)	معصیت میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔
لاطاعۃَ لمن عصی اللہَ (طبرانی)	کوئی اطاعت اس شخص کے لیے نہیں ہے جو اللہ کا نافرمان ہو۔
لاطاعۃَ لمخلوقٍ فی معصیۃِ الخالقِ (شرح السنہ)	خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔

کتاب و سنت کے یہ تمام محکمات اس باب میں ناطق ہیں کہ ایک اسلامی ریاست میں مجلس قانون ساز کوئی ایسا قانون بنانے کا حق نہیں رکھتی جو اللہ اور رسول کے احکام کے خلاف ہو، اور اگر وہ ایسا کوئی قانون بنا دے تو وہ رد کر دیئے جانے کے لائق ہے نہ کہ نافذ ہونے کے لائق۔ اسی طرح یہ آیات اور احادیث اس باب میں بھی ناطق ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کی عدالتوں میں اللہ اور رسول کا قانون لازماً نافذ ہونا چاہیے اور جو بات کتاب و سنت کی دلیل سے حق ثابت کر دی جائے اسے کوئی جج اس بنا پر رد نہیں کر سکتا کہ لیجسلیچر کا بنایا ہوا قانون اس کے خلاف ہے۔ تصادم کی صورت میں اللہ اور رسول کا قانون نہیں بلکہ لیجسلیچر کا قانون حدود دستور سے خارج قرار پانا چاہیے۔ اسی طرح یہ آیات اور احادیث اس باب میں بھی ناطق ہیں کہ اسلامی ریاست کی انتظامیہ کو ایسا کوئی حکم دینے یا ضابطہ بنانے کا حق نہیں ہے جس سے خدا اور رسول کی معصیت لازم آتی ہو۔ اگر وہ ایسا کوئی حکم دے اور لوگ اس کی اطاعت نہ کریں تو وہ مجرم نہیں ہوں گے، بلکہ اس کے برعکس، خود حکومت زیادتی کی مرتکب ہو گی۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اولی الامر مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کی دو دلیلیں تو خود اس آیت ہی میں موجود ہیں۔ اول یہ کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فرمانے کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ جن اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہ مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ دوم یہ کہ نزاع کی صورت میں متنازع فیہ معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف پھیرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ رعایا اور حکومت کی نزاع میں اللہ اور رسول کو حَکَم صرف مسلمان اولی الامر ہی مان سکتے ہیں نہ کہ کافر اولی الامر۔ مزید برآں مستند احادیث کی تصریحات بھی اسی کی تائید بلکہ تاکید کرتی ہیں۔ چنانچہ ابھی اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات نقل ہو چکے ہیں کہ "اگر ایک نکٹا غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔" اور یہ کہ "کوئی اطاعت اس شخص کے لیے نہیں ہے جو اللہ کا نافرمان ہو۔" ایک اور حدیث میں حضرت عُبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی تھی کہ:۔

اَن لا ننازع الامر اھلہٗ الا ان	ہم اپنے حکمرانوں سے جھگڑا نہ کریں گے اِلّا یہ کہ ہم
تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ	ان کے کاموں میں کھلا کھلا کفر دیکھیں جو ہمارے پاس
فیہ برھان (بخاری ومسلم)	ان کے خلاف اللہ کی طرف سے دلیل ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب صحابۂ کرام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بُرے حاکموں کے خلاف بغاوت کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:۔

لا ما اقاموا فیکم الصلوٰۃ (مسلم)	نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے صاحب امر بننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک اشتراکی ریاست میں منکرینِ اشتراکیت، اور ایک جمہوری ریاست میں مخالفینِ جمہوریت کے لیے اولی الامر بننے کا نہ عقلاً کوئی موقع ہے نہ عملاً۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے مسلمان اپنے اولی الامر سے نزاع کا حق رکھتے ہیں اور نزاع کی صورت میں فیصلہ جس چیز پر چھوڑا جائے گا وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہوگی۔ یہ آخری سند جس کے حق میں بھی فیصلہ دے اسے ماننا پڑے گا خواہ فیصلہ اولی الامر کے حق میں ہو یا رعایا کے حق میں۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ اس حکم کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کوئی ادارہ ایسا ہونا چاہیے جس کے پاس نزاع لے جائی جائے اور جس کا کام یہ ہو کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے مطابق اس نزاع کا فیصلہ کرے۔ یہ ادارہ خواہ کوئی مجلس علماء ہو یا سپریم کورٹ یا کوئی اور، اس کے تعین کی کسی خاص شکل پر شریعت نے ہمیں مجبور نہیں کر دیا ہے۔ مگر بہرحال ایسا کوئی ادارہ مملکت میں ہونا چاہیے، اور اس کو یہ حیثیت حاصل ہونی چاہیے کہ انتظامیہ اور مقننہ اور عدلیہ کے احکام اور فیصلوں کے خلاف اس کے پاس مرافعہ کیا جا سکے۔ اور اس کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ کتاب وسنت کی ہدایات کے مطابق وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرے۔

(۹)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ (النساء-۸)	اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان حکم دیا فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔ (المائدہ-۲)	اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔

یہ آیات اگرچہ وسیع ترین مفہوم میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر عدل کا پابند بناتی ہیں، مگر ظاہر ہے کہ ان کے اس تقاضے سے اسلامی ریاست آزاد نہیں ہو سکتی۔ لامحالہ اُس کو بھی عدل ہی کا پابند ہونا چاہیے، بلکہ اسے تو بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہیے، کیونکہ حکم بین الناس کا سب سے زیادہ طاقتور ادارہ وہی ہے اور اگر اس کے حکم میں عدل نہ ہو تو پھر معاشرے میں

اور کہیں عدل نہیں ہو سکتا۔

اب دیکھیے کہ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی سنت سے حکم بین الناس میں عدل برتنے کا کیا طریقہ ثابت ہوتا ہے۔

(۱) حجۃ الوداع کے مشہور خطبے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کے جن بنیادی اصول کا اعلان فرمایا تھا ان میں ایک اہم اصول یہ بھی تھا:

فان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا	یقیناً تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی محترم ہیں جیسے آج حج کا یہ دن محترم ہے۔

اس اعلان میں مملکت اسلامیہ کے تمام شہریوں کو جان، مال اور آبرو کی حرمت کا بنیادی حق عطا کیا گیا ہے جس کا بہرحال ہر اس ریاست کو التزام کرنا ہوگا جو "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم ہو۔[1]

(۲) یہ حرمت کس حال میں کس طرح ٹوٹ سکتی ہے؟ اس کا تعین نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

فاذا فعلوا ذالک عصموا منی دماءھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ (بخاری ومسلم)	پھر جب لوگ یہ کام (یعنی شہادت توحید و رسالت اور اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ) کر دیں تو وہ اپنی جانیں مجھ سے بچالیں گے، الا یہ کہ اسلام کے کسی حق کی بنا پر وہ مجرم ہوں، اور ان کی نیتوں کا حساب لینا اللہ کے ذمے ہے۔
فقد حرمت علینا دماؤھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ (بخاری)	پس ان کی جان و مال ہم پر حرام ہیں الا یہ کہ جان و مال ہی کا کوئی حق ان پر قائم ہو۔ اور ان کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

[1] اگرچہ اس حدیث میں صرف مسلمانوں کے بنیادی حقوق کا ذکر ہے، لیکن اسلامی شریعت کا یہ مسلّم اصول ہے کہ جو غیر مسلم اسلامی ریاست کی حفاظت میں رہنا قبول کریں ان کو دیوانی اور فوجداری قانون کی نگاہ میں وہی حقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

فمن قالها فقد عصم منی ماله و نفسه الا بحقه و حسابه علی الله۔ (بخاری)

پھر جو اس کا (یعنی کلمۂ توحید کا) قائل ہو جائے اس نے مجھ سے اپنا مال اور اپنا نفس بچا لیا الّا یہ کہ اللہ کا کوئی حق اس پر قائم ہو، اور اس کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

یہ احادیث اس باب میں ناطق ہیں کہ اسلامی ریاست میں کسی شہری کی آزادیٔ نفس اور حرمت جان و مال و آبرو پر کوئی دست درازی نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اسلامی قانون کی رو سے اُس پر (یا اس کے خلاف)، کوئی حق ثابت نہ کر دیا جائے۔

(۳) کسی پر (یا کسی کے خلاف)، حق کا اثبات کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم یوں بیان فرماتے ہیں:

اذا جلس الیک الخصمان فلا تقض بینهما حتی تسمع من الاخر کما سمعت من الاول (ابوداؤد، ترمذی، احمد)

جب تیرے سامنے دو فریق اپنا معاملہ لے کر بیٹھیں تو ان کا فیصلہ نہ کر جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لے جس طرح پہلے کی سنی ہے۔

اور حضرت عمرؓ ایک مقدمے کے فیصلے میں تصریح کرتے ہیں:

لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر العدل (موطا)

اسلام میں کوئی شخص عدل کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔

اس مقدمے کی جو تفصیل مؤطا میں دی گئی ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے نو مفتوح علاقے میں لوگ جھوٹی چغلیاں کھا کھا کر دوسروں کو پکڑوا رہے تھے۔ اس کی شکایت جب حضرت عمرؓ کے پاس لائی گئی تو آپ نے اس کے فیصلے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں عدل سے مراد "معروف عدالتی کارروائی" (due process of law) ہے یعنی ایک آدمی کا جرم کھلی عدالت میں ثابت کیا جائے اور اسے صفائی کا پورا موقع دیا جائے۔ اس کے بغیر اسلام میں کوئی شخص قید نہیں کیا جا سکتا۔

دہم، حضرت علیؓ کے زمانے میں جب خوارج کا ظہور ہوا، جو سرے سے ریاست ہی کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے، تو آپ نے انہیں لکھا کہ:-

کونوا حیث شئتم وبیننا وبینکم الا تسفکوا دما ولا تقطعوا سبیلا و لا تظلموا احداً فان فعلتم نبذت الیکم الحرب (نیل الاوطار)	تم جہاں چاہو رہو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون نہ بہاؤ اور بدامنی نہ پھیلاؤ اور کسی پر ظلم نہ کرو۔ اگر ان کاموں میں سے کوئی کام تم نے کیا تو میں تمہارے خلاف جنگ کرونگا۔

یعنی خیالات تم جو چاہو رکھو، تمہارے خیال اور نیت پر گرفت نہ کی جائے گی۔ البتہ اگر تم اپنے خیالات کے مطابق حکومت الٹ دینے کی کوشش کروگے تو یقیناً تمہارے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اسلامی تصور عدل کسی حال میں بھی انتظامیہ کو یہ اختیارات دینے کا روادار نہیں ہے کہ وہ معروف عدالتی کارروائی کے بغیر جس کو چاہیں پکڑیں، جسے چاہیں قید کردیں، جسے چاہیں خارج البلد کریں، جس کی چاہیں زبان بندی کردیں اور جسے چاہیں اظہار رائے کے وسائل سے محروم کردیں۔ اس طرح کے اختیارات جو ریاست اپنی انتظامیہ کو دیتی ہو وہ اسلامی ریاست ہرگز نہیں ہوسکتی۔

پھر حکم بین الناس میں عدل برتنے کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہم کو اسلام کی مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں صدر ریاست اور گورنروں اور اعلیٰ حکام اور عامۃ الناس، سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدالت ہے۔ کسی کے لیے کوئی قانونی امتیاز نہیں ہے، کسی کے لیے خاص عدالتیں نہیں ہیں، اور کوئی قانون کی پکڑ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت میں خود اپنے آپ کو پیش کیا کہ جس کو میرے خلاف کوئی دعویٰ ہو وہ لائے اور اپنا حق وصول کرے۔ حضرت عمرؓ نے ایک والی ریاست، جبلہ بن ایہم غسانی سے ایک بدوی کو قصاص دلوایا۔ حضرت عمرو بن العاص نے گورنروں کے لیے قانونی تحفظ

کا مطالبہ کیا تو حضرت عمرؓ نے اسے ماننے سے صاف انکار کر دیا اور عام لوگوں کو یہ حق دیا کہ جس حاکم کے خلاف انہیں شکایت ہو اسے کھلی عدالت میں لائیں۔

(۱۰)

وَفِيٓ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (الذاریات - ۱)

ان کے مالوں میں حق تھا مدد مانگنے والے کے لیے اور رزق سے محروم رہ جانے والے کے لیے۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ۔ (التوبہ - ۱۳)

ان کے مالوں میں سے صدقہ وصول کر کے ان کو (بری صفات سے) پاک کرو اور ان کو (اچھی صفات میں) بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔

ان اللہ قد فرض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیاءھم فترد علی فقراءھم (بخاری ومسلم)

اللہ نے مسلمانوں پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے حاجتمندوں پر لوٹا دیا جائے گا۔

السلطان ولی من لا ولی لہ (ابوداؤد۔ ترمذی۔ مسند احمد۔ ابن ماجہ۔ دارمی)

حکومت اس کی سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو۔

من مات وعلیہ دین ولم یترک وفاءً فعلیّ قضاءہ ومن ترک مالا فلورثتہ۔

جو شخص مر جائے اور اس کے ذمے قرض ہو اور اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے ذمے ہے اور جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔

وفی روایۃ من ترک دینا او ضیاعا فلیاتنی فانا مولاہ

ایک دوسری روایت میں ہے جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے پسماندگان چھوڑ جائے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئیں میں ان کا سرپرست ہوں۔

وفی روایۃ من ترک مالا

ایک اور روایت میں ہے جو مال چھوڑے تو وہ

فلورثتہ ومن ترک کلا فالینا ۔ اس کے وارثوں کا حق ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے

(بخاری و مسلم) تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمے ہے ۔

انا وارث من لا وارث لہ اعقل جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا میں وارث ہوں ۔ اس

عنہ وارثہ (ابوداؤد) کی طرف سے دیت ادا کرونگا اور اس کی میراث لونگا ۔

یہ آیات اور احادیث تصریح کرتی ہیں کہ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ایک اہم فرض زکوٰۃ کی تنظیم ہے اور اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے حدود کے اندر تمام اُن لوگوں کی کفیل بنے جو مدد کے محتاج ہوں اور وسائل رزق سے محروم رہ گئے ہوں ۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے دستوری احکام جو ہم کو کتاب و سنت میں ملتے ہیں ۔ اگرچہ دستوری مسائل سے متعلق قرآن اور حدیث میں اور بھی بہت سی ہدایات موجود ہیں ، مگر چونکہ ان کا تعلق دستور سے کم اور دستوری قانون سے زیادہ ہے اسلیے ہم نے ان کو یہاں بیان نہیں کیا ہے ۔ اب ہر شخص جو دستور کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو ، ہماری پیش کردہ ان آیات اور احادیث کو دیکھ کر خود رائے قائم کرے کہ آیا ان میں ایک اسلامی ریاست کی اصولی بنیادیں صاف صاف بیان کردی گئی ہیں یا نہیں ! اگر کوئی صاحب محض دعووں کے بجائے علمی استدلال سے ثابت کردیں کہ ان احکام کا دستور سے کوئی تعلق نہیں ہے ، اور ہمیں بتائیں کہ دستور کے وہ کونسے بنیادی مسائل (تفصیلات نہیں بلکہ بنیادی مسائل) ہیں جن میں کتاب و سنت سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی تو ہم ضرور ان کے شکر گزار ہونگے لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مسائل جن پر ہم نے اوپر بحث کی ہے دستوری مسائل نہیں ہیں ، اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان مسائل پر قرآن و حدیث کی ان تعلیمات سے کوئی روشنی نہیں پڑتی ، تو اس کے بعد غیر منافق شرفاء کے لیے دو ہی راستے کھلے رہ جاتے ہیں ۔ یا تو وہ سیدھی طرح ان احکام کو تسلیم کریں اور ملک کے دستور میں ان کو ثبت کر کے باقی تفصیلات جس طرح مناسب سمجھیں مرتب کرتے رہیں ۔ یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ ہم نہ قرآن کو مانتے ہیں نہ سنت کو ، ہمارا ایمان اُس ڈیموکریسی پر ہے جس کا اسوۂ حسنہ ہم کو امریکہ اور انگلستان اور ہندوستان کے دستور سلطنت میں ملتا ہے ۔ ان دو راستوں میں سے جو راستہ بھی وہ اختیار کریں گے ، بہرحال وہ راستباز انسانوں کے شایان شان ہوگا ۔ رہا یہ طریقہ کہ سامنے آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہو اور آدمی کہے جائے کہ روشنی کہیں موجود نہیں ہے تو اس سے لوگ فریب کھائیں یا نہ کھائیں مگر کہنے والا اپنی عزت ضرور کھو دیتا ہے ۔

اسلامی نظامِ تعلیم

اور

پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر

[یہ وہ تقریر ہے جو اسلامی جمعیتہ طلبہ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ۵ / فروری ۱۹۵۲ء کو برکت علی محمڈن ہال لاہور میں کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی کے باعث اب تک اسے اشاعت کی خاطر مرتب کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لیے اسے اتنی تاخیر کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے]

الحمد لله رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسوله الکریم وعلی اٰله و اصحابه اجمعین۔

جناب صدر! اور حاضرین و حاضرات!

جس مسئلے پر مجھے آپ کے سامنے اظہارِ خیال کرنا ہے وہ یہ ہے کہ "اسلامی نظامِ تعلیم کو اس ملک میں رائج کرنے کی عملی صورت کیا ہے؟" میں نے اپنی تقریر کے لیے یہ موضوع اختیار نہیں کیا ہے کہ "اس ملک میں کونسا نظامِ تعلیم جاری ہو؟" اس لیے کہ یہ مملکت اسلام ہی کے نام پر بنائی گئی ہے، اس کے قیام کا مطالبہ ہی اسلام پر مبنی تھا، اس کے متعلق اول روز سے کہا جاتا رہا ہے کہ ہم ایک الگ خطۂ زمین اس لیے چاہتے ہیں کہ اس میں اسلامی تہذیب اور اسلامی نظامِ زندگی کو از سرِ نو زندہ اور قائم کیا جائے، اور تقدیرِ الٰہی بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسے لازماً اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا مرکز بننا ہے اس لیے اب یہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ کس قسم کا نظامِ تعلیم اس ملک میں رائج ہو۔ بلکہ یہ امر طے شدہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں اسلامی نظامِ تعلیم ہی کو رائج ہونا ہے۔ البتہ اگر کوئی چیز زیرِ غور ہونی چاہیے اور ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ تعلیم کو اسلام کے سانچوں میں ڈھالنے کے

لیے کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔

تاہم یہ بات مجھے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس مملکت کے قیام کے چار ساڑھے چار سال بعد آج تک ہمارے ہاں یہی مسئلہ زیر بحث ہے کہ تعلیم کو کس طرح اسلامی سانچوں میں ڈھالا جائے۔ یہ کام تو مملکت کے قیام کے بعد سب سے پہلے کرنے کا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا میں کوئی مملکت بھی اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک کہ وہ اپنے چلانے والوں کو تربیت دینے کا اور ان کو اپنے مقصد اور اپنے مزاج کے مطابق تیار کرنے کا انتظام نہ کرے۔ اس لحاظ سے حقیقت میں تعلیم کا مسئلہ ایک مملکت کے لیے بنیادی مسائل میں سے ہے، اور یہ ایسی چیز تھی کہ ملک کے قیام کے بعد اس کے سربراہ کاروں کو سب سے پہلے اس کی فکر ہونی چاہیے تھی۔ لیکن ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ چار ساڑھے چار سال کے بعد بھی کوئی آثار ہمیں ایسے نظر نہیں آتے کہ کسی نے نظام تعلیم کو اسلامی سانچوں میں ڈھالنے کے متعلق کچھ بھی سوچا ہو۔ عملی اقدامات تو درکنار ہمیں سوچنے کے آثار بھی نظر نہیں آتے۔

بہر حال اب جبکہ صورت حال یہ ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ لوگ آگے بڑھیں اور بڑھ کر ان کو بتائیں کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم کس حد تک، کس طرح اور کس کس حیثیت سے ہمارے اس مقصد کی ضد پڑ رہا ہے جس کے لیے ہماری یہ مملکت قائم ہوئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کو یہ بھی بتائیں کہ اگر نظام تعلیم کو اس مقصد کے مطابق ڈھالنا ہے تو کس طرح ڈھالا جائے، اس کی عملی صورت کیا ہے اور اس کا نقشہ کیا ہونا چاہیے۔ اسی خدمت کو انجام دینے کے لیے میں آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں اور دوسرے جو لوگ بھی اس طرح کی فکر رکھنے والے ہیں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بھی اس فرض کو انجام دیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ان نقائص کو اچھی طرح سمجھ لیں جو ہمارے نظام تعلیم میں اس وقت پائے جاتے ہیں۔ جب تک ہم یہ بات نہ جان لیں کہ جو چیز اس وقت موجود ہے اس میں کیا خرابی ہے، ہم یہ نہیں جان سکتے کہ اس میں اصلاح کس طرح اور کس شکل میں ہونی چاہیے۔ ہمارے ملک میں اس وقت دو طرح کے نظام تعلیم رائج ہیں۔ ایک نظام تعلیم ہمارے پرانے طرز کے مدارس میں رائج

ہے جو ہماری مذہبی ضروریات پوری کرنے کے لیے علماء تیار کرتا ہے، اور دوسرا نظامِ تعلیم وہ ہے جو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے اور وہ مذہبی دائرے سے باہر ہمارے پورے نظامِ زندگی کو چلانے کے لیے کارکن تیار کرتا ہے۔ میں ان دونوں کے نقائص آپ کے سامنے وضاحت سے بیان کروں گا۔

قدیم نظامِ تعلیم | جہاں تک ہمارے پرانے نظامِ تعلیم کا تعلق ہے وہ آج سے صدیوں پہلے کی بنیادوں پر قائم ہے۔ جس وقت یہاں انگریزی حکومت آئی اور وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے، اُس وقت جو نظامِ تعلیم ہمارے مُلک میں رائج تھا وہ ہماری اُس وقت کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ اس نظامِ تعلیم میں وہ ساری چیزیں پڑھائی جاتی تھیں جو اس وقت کے نظامِ مملکت کو چلانے کے لیے درکار تھیں۔ اُس میں صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں تھی بلکہ اس میں فلسفہ بھی تھا، اس میں منطق بھی تھی، اُس میں ریاضی بھی تھی، اس میں ادب بھی تھا اور دوسری چیزیں بھی تھیں۔ اُس زمانے کی سول سروس کے لیے جس طرح کے علوم درکار تھے وہ سب طلبہ کو پڑھائے جاتے تھے۔ لیکن جب وہ سیاسی انقلاب برپا ہوا جس کی بدولت ہم غلام ہوئے تو اس پورے نظامِ تعلیم کی افادیت ختم ہو گئی۔ اُس نظامِ تعلیم سے نکلے ہوئے لوگوں کے لیے نئے دَور کی مملکت میں کوئی جگہ نہیں رہی جس قسم کے علوم اِس دوسری مملکت کو درکار تھے وہ اس کے اندر شامل نہیں تھے۔ اور جو علوم اس میں شامل تھے اُن کے جاننے والوں کی اِس دوسری مملکت کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم چونکہ اس کے اندر ہماری صدیوں کی قومی میراث موجود تھی اور ہماری مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی اس کے اندر کچھ نہ کچھ سامان موجود تھا (اگرچہ کافی نہ تھا)، اس لیے اس زمانے میں ہماری قوم کے ایک اچھے خاصے بڑے عنصر نے یہ محسوس کیا کہ اس نظام کو جس طرح بھی ہو سکے قائم رکھا جائے۔ تاکہ ہم اپنی آبائی میراث سے بالکل منقطع نہ ہو جائیں۔

اس غرض کے لیے انہوں نے اس کو جوں کا توں قائم رکھا۔ لیکن جتنے جتنے حالات بدلتے گئے اتنی ہی زیادہ اس کی افادیت گھٹتی چلی گئی، کیونکہ اس نظامِ تعلیم کے تحت جو لوگ تعلیم پا کر نکلے اُن کو وقت کی زندگی اور اس کے مسائل سے کوئی مناسبت ہی نہ رہی۔ اب جو لوگ اس نظامِ تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پا کر نکل رہے ہیں اُن کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری

مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں، یا کچھ مدرسے کھول لیں اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں تاکہ ان جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہو۔ اس طرح ان کی ذات سے اگرچہ کچھ نہ کچھ فائدہ بھی ہمیں پہنچتا ہے یعنی ان کی بدولت ہمارے اندر قرآن و دین کا کچھ نہ کچھ علم پھیلتا ہے، دین کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت لوگوں کو حاصل ہو جاتی ہے، اور ہماری مذہبی زندگی میں کچھ نہ کچھ حرارت باقی رہ جاتی ہے لیکن اس فائدے کے مقابلے میں جو نقصان ان سے ہم کو پہنچ رہا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ وہ نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہیں، نہ موجودہ زندگی کے مسائل پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کر سکتے ہیں، نہ اُن کے اندر اب یہ صلاحیت ہے کہ دینی اصولوں پر قوم کی رہنمائی کر سکیں اور نہ وہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے کسی مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اب ان کی بدولت دین کی عزت میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹی اس میں کچھ کمی ہو رہی ہے۔ دین کی جیسی نمائندگی آج ان کے ذریعہ سے ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں دین سے روز بروز بُعد بڑھتا جا رہا ہے اور دین کے وقار میں کمی آ رہی ہے۔ پھر ان کی بدولت ہمارے ہاں مذہبی جھگڑوں کا ایک سلسلہ ہے جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا، کیونکہ اُن کی ضروریاتِ زندگی انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان جھگڑوں کو تازہ رکھیں اور بڑھاتے رہیں۔ یہ جھگڑے نہ ہوں تو قوم کو سرے سے ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔

یہ ہے ہمارے پرانے نظامِ تعلیم کی پوزیشن۔ اور یہ بھی میں وضاحت کے ساتھ کہہ دوں کہ حقیقت میں وہ دینی تعلیم بہت کم ہے۔ دراصل وہ اب سے دو ڈھائی سو برس پہلے کی سول سروس کی تعلیم ہے جس میں زیادہ تر اس وجہ سے دینی تعلیم کا جوڑ لگایا گیا تھا کہ اس زمانے میں اسلامی فقہ ہی ملک کا قانون تھی اور اسے نافذ کرنے والوں کے لیے فقہ اور اس کی بنیادوں کا جاننا ضروری تھا۔ آج ہم غنیمت سمجھ کر اُسی کو اپنی دینی تعلیم سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کے اندر دینی تعلیم کا عنصر بہت کم ہے۔ کوئی عربی مدرسہ ایسا نہیں ہے جس کے نصابِ تعلیم میں پورا قرآن مجید داخل ہو۔ صرف ایک یا دو سورتیں (سورۂ بقرہ یا سورۂ آلِ عمران) باقاعدہ درساً درساً پڑھائی جاتی ہیں۔ باقی سارا قرآن اگر کہیں شاملِ درس ہے بھی تو صرف اس کا ترجمہ پڑھا دیا جاتا ہے۔ تحقیقی مطالعۂ قرآن کسی مدرسے

کے نصاب میں بھی شامل نہیں۔ یہی صورت حال حدیث کی ہے۔ اس کی بھی باقاعدہ تعلیم جیسی کہ ہونی چاہیئے جیسی کہ محدث بننے کے لیے درکار ہے، کہیں نہیں دی جاتی۔ درسِ حدیث کا جو طریقہ ہمارے ہاں رائج ہے وہ یہ ہے کہ جب فقہی اور اعتقادی جھگڑوں سے متعلق کوئی حدیث آجاتی ہے تو اس پر دو دو تین تین دن صرف کر دیے جاتے ہیں۔ باقی رہیں وہ حدیثیں جو دین کی حقیقت سمجھاتی ہیں، یا جن میں اسلام کا معاشی اور سیاسی اور تمدنی اور اخلاقی نظام بیان کیا گیا ہے، یا جن میں دستورِ مملکت، یا نظامِ عدالت یا بین الاقوامی قانون پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان پر سے استاد اور شاگرد دونوں اس طرح رواں دواں گزر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی بات قابلِ توجہ ہے ہی نہیں۔ حدیث اور قرآن کی بہ نسبت ان کی توجہ فقہ کی طرف زیادہ ہے، لیکن اس میں زیادہ تر، بلکہ تمام تر جزئیاتِ فقہ کی تفصیلات ہی توجہات کا مرکز رہتی ہیں۔ فقہ کی تاریخ، اس کے تدریجی ارتقاء، اس کے مختلف اسکولوں کی امتیازی خصوصیات، ان اسکولوں کے متفق علیہ اور مختلف فیہ اصول، اور ائمۂ مجتہدین کے طرقِ استنباط، جن کے جانے بغیر کوئی شخص حقیقت میں فقیہ نہیں بن سکتا، ان کے درس میں سرے سے شامل ہی نہیں ہیں، بلکہ ان چیزوں پر شاگرد تو درکنار، استاد بھی نگاہ نہیں رکھتے۔

اس طرح یہ نظامِ تعلیم ہماری اُن مذہبی ضروریات کے لیے بھی سخت ناکافی ہے جن کی خاطر اس کو باقی رکھا گیا تھا۔ رہیں دنیوی ضروریات تو ان سے تو اس کو سرے سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

جدید نظامِ تعلیم | اس کے بعد اُس نظامِ تعلیم کو لیجیے جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا۔ دنیا میں جو نظامِ تعلیم بھی قائم کیا جائے، اس میں اولین بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کس قسم کے آدمی تیار کرنا چاہتے ہیں اور آدمیت کا وہ کیا نقشہ آپ کے سامنے ہے جس کے مطابق آپ لوگوں کو تعلیم و تربیت دے کر ڈھالنا چاہتے ہیں؟ اس بنیادی سوال کے لحاظ سے آپ دیکھیں تو یقیناً انگریز کے سامنے انسانیت کا وہ نقشہ ہرگز نہیں تھا جو مسلمانوں کے سامنے ہونا چاہیے۔ انگریز نے یہ نظامِ تعلیم یہاں اس لیے قائم نہیں کیا تھا کہ مسلمانوں کی کلچر کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے کارکن تیار کرے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز اس کے پیشِ نظر نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اس کے پیشِ نظر انسانیت کا وہ نقشہ بھی نہیں تھا جو خود اپنے

ملک انگلستان میں اس کے پیشِ نظر تھا۔ وہ اُس مقصد کے لیے یہاں آدمی تیار نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے لیے وہ اپنے ملک میں اپنی قوم کے لیے تیار کرتا تھا۔ وہ یہاں ایسے لوگ تیار نہیں کرنا چاہتا تھا جو ایک آزاد قومی حکومت کو چلانے کے لیے موزوں ہو۔ یہ چیز تو وہ اپنے ملک میں چاہتا تھا نہ کہ آپ کے ملک میں آپ کے ملک میں جیسے آدمی تیار کرنا اس کے پیشِ نظر تھا وہ یہ تھا کہ وہ باہر کی ایک مٹھی بھر قوم کو جو ان کے ملک میں آکر حکومت کر رہی تھی، حکومت چلانے میں مدد دیں۔ اس کو ایسے آدمی درکار تھے جو اس کی زبان سمجھتے ہوں، جن سے وہ ربط اور تعلق رکھ سکے اور کام لے سکے، جو اُس کے اُن اصولوں کو جانتے اور سمجھتے ہوں جن پر وہ ملک کا نظام چلانا چاہتا تھا، اور جن میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ اس کے آلۂ کار بن سکیں یہ مقصد اس کے سامنے تھا اور اس مقصد ہی کے لیے اس نے یہ نظامِ تعلیم رائج کیا۔

بے خدا تعلیم اس نظامِ تعلیم میں اس نے جتنے علوم پڑھائے، اُن میں اسلام کا کوئی شائبہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ خود یورپ میں اُن سارے علوم کا جو ارتقاء ہوا تھا وہ تمام تر خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی رہنمائی میں ہوا تھا جو مذہبی طبقہ وہاں موجود تھا، وہ پہلے ہی فکر و عمل کے میدان سے بے دخل کیا جا چکا تھا اس لیے تمام علوم کا ارتقاء، خواہ وہ سائنس ہو، خواہ وہ فلسفہ ہو، خواہ تاریخ ہو، خواہ عمرانیات ہو، ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوا جو اگر خدا کے منکر نہ تھے تو کم از کم اپنی دنیوی زندگی میں خدا کی رہنمائی کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہ کرتے تھے۔ انگریز نے اپنے انہی علوم کو لاکر، انہی کتابوں کے ساتھ آپ کے اس ملک میں رائج کیا اور آج تک انہی علوم کو اُسی طرز پر یہاں پڑھایا جا رہا ہے۔ اس نظامِ تعلیم کے تحت جو لوگ پڑھتے رہے اُن کا ذہن قدرتی طور پر بغیر اپنے کسی قصد اور اپنے کسی ارادے کے آپ سے آپ اس طرح بنتا چلا گیا کہ وہ دین سے، اور دینی نقطۂ نظر سے، اور دینی اخلاق سے، اور دینی فکر سے روز بروز بعید تر ہوتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی تعلیم کے نقطۂ آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تعلیم تک دنیا کے متعلق جتنی معلومات بھی حاصل کرے وہ ساری کی ساری خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے خالی ہوں، اُس کے ذہن میں آخر خدا کا اعتقاد کیسے جڑ پکڑ سکتا ہے۔ اس کی درسی کتابوں میں خدا کا کہیں ذکر ہی نہ ہو۔ وہ تاریخ پڑھے تو اس میں پوری انسانی زندگی اپنی قسمت آپ ہی بناتی اور بگاڑتی نظر آئے۔ وہ فلسفہ پڑھے تو اس

میں کائنات کی گتھی خالقِ کائنات کے بغیر سلجھانے کی کوشش ہو رہی ہو۔ وہ سائنس پڑھے تو اس میں سارا کارخانۂ ہستی کسی صانعِ حکیم اور ناظم و مدبر کے بغیر چلتا ہوا دیکھا جائے۔ وہ قانون، سیاست، معیشت اور دوسرے علوم پڑھے تو ان میں سرے سے یہ امر زیرِ بحث ہی نہ ہو کہ انسانوں کا خالق اُن کے لیے زندگی کے کیا اصول اور احکام دیتا ہے، بلکہ اُن سب کا بنیادی نظریہ ہی یہ ہو کہ انسان آپ ہی اپنی زندگی کے اصول بنانے کا حق رکھتا ہے۔ ایسی تعلیم پانے والے سے کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ تو خدا کا انکار کر۔ وہ آپ سے آپ خدا سے بے نیاز اور خدا سے بے فکر ہوتا چلا جائے گا۔

اخلاق سے خالی تعلیم یہ تعلیم خدا پرستی اور اسلامی اخلاق سے تو خیر خالی ہے ہی، مگر غضب یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاں کے نوجوانوں میں وہ بنیادی انسانی اخلاقیات تک پیدا نہیں کرتا جن کے بغیر کسی قوم کا دنیا میں ترقی کرنا تو درکنار، زندہ رہنا بھی مشکل ہے۔ اس کے زیرِ اثر پرورش پاکر جو نسلیں اٹھ رہی ہیں وہ مغربی قوموں کے عیوب سے تو ماشاء اللہ پوری طرح آراستہ ہیں، مگر ان کی خوبیوں کی چھینٹ تک ان پر نہیں پڑی ہے۔ ان میں نہ فرض شناسی ہے، نہ مستعدی و جفاکشی، نہ ضبطِ اوقات، نہ صبر و ثبات، نہ عزم و استقلال، نہ باقاعدگی و باضابطگی، نہ ضبطِ نفس، نہ اپنی ذات سے بالاتر کسی چیز کی وفاداری۔ وہ بالکل خودرَو درختوں کی طرح ہیں جنہیں دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی قومی کیرکٹر بھی ہے۔ ان کو معزز سے معزز پوزیشن میں ہو کر بھی کسی ذلیل سے ذلیل بددیانتی اور بدکرداری کے ارتکاب میں دریغ نہیں ہوتا۔ ان میں بدترین قسم کے رشوت خوار، خویش پرور، سفارشیں کرنے اور سننے والے، بلیک مارکٹنگ کرنے اور کرانے والے ناجائز درآمد و برآمد کرنے اور کرانے والے، انصاف اور قانون اور ضابطے کا خون کرنے والے، فرض سے جی چرانے اور لوگوں کے حقوق پر چھری چلانے والے، اور اپنے ذرا سے مفاد پر اپنی پوری قوم کے مفاد اور فلاح کو قربان کر دینے والے، ایک دو نہیں ہزاروں کی تعداد میں، ہر شعبۂ زندگی میں، ہر جگہ آپ کو کام کرتے نظر آتے ہیں۔ انگریز کے ہٹ جانے کے بعد مملکت کو چلانے کی ذمہ داری کا بار اسی تعلیم کے تیار کیے ہوئے لوگوں نے سنبھالا ہے، اور چار پانچ سال ہی کے اندر ان بے سیرت کارکنوں کے ہاتھوں ملک کا جو حال ہوا ہے وہ آپ سب دیکھ رہے ہیں۔ اور جو نسل اب اس تعلیم گاہوں میں پرورش پارہی

ہے اس کے اخلاق و کردار کا حال آپ جب چاہیں درسگاہوں میں، ہوسٹلوں میں، تفریح گاہوں میں اور قومی تقریبات کے موقع پر بازاروں میں دیکھ سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس تعلیم میں خدا پرستی اور اسلامی اخلاق نہ سہی، آخر وہ اخلاق کیوں نہیں پیدا ہوتے جو انگریزوں میں، جرمنوں میں، امریکیوں میں اور دوسری ترقی یافتہ مغربی قوموں میں پیدا ہوتے ہیں؟ اُن کے اندر بنیادی انسانی اخلاقیات تو بدرجۂ کمال پائے جاتے ہیں۔ یہاں وہ بھی مفقود ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی انسانی اخلاقیات پیدا کرنے کی فکر وہ نظامِ تعلیم کرتا ہے جو ایک آزاد قوم اپنے آزاد نظامِ زندگی کو چلانے کے لیے بناتی ہے۔ اس کو لامحالہ اپنے تمدن کے بقا اور ارتقا کی خاطر ایسے کارکن تیار کرنے کی فکر ہوتی ہے جو مضبوط اور قابلِ اعتماد سیرت کے مالک ہوں۔ انگریز کو ایسے کارکنوں کی ضرورت اپنے ملک میں تھی نہ کہ آپ کے ملک میں۔ آپ کے ملک میں تو انگلستان کے برعکس اسے وہ اخلاق پیدا کرنے مطلوب تھے جو غلاموں میں ہونے چاہئیں۔ جو ان لوگوں میں ہونے چاہئیں جو اپنے ہاتھوں اپنے ہی ملک کو فتح کر کے اپنی قوم کے دشمنوں کے حوالے کر دیں اور پھر اپنے ملک کا نظم و نسق اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے چلا سکیں۔ اس کام کے لیے جیسے اخلاقیات کی ضرورت تھی ویسے ہی اخلاقیات انگریزوں نے یہاں پیدا کرنے کے لیے وہ تعلیمی مشینری بنائی جو آج تک جوں کی توں اسی شان سے چل رہی ہے۔ اس مشین سے ایک آزاد ملک کے لیے مضبوط پُرزے ڈھلنے کی اگر کوئی شخص توقع رکھتا ہے تو اسے پہلے اپنی عقل کے ناخن لینے کی فکر کرنی چاہیے۔

جدید تعلیم کے ساتھ دینیات کا جوڑ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد جب یہ نظامِ تعلیم ملک میں رائج ہوا اور ترقی و خوشحالی کے تمام دروازے اُن لوگوں کے لیے بند کر دیے گئے جو یہ تعلیم حاصل نہ کریں، تو ہماری قوم کے صاحبِ فکر و تدبیر لوگوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ نظامِ تعلیم ہماری نئی نسلوں کو بالکل ہی نامسلمان بنا کر نہ رکھ دے۔ اس لیے انہوں نے چاہا کہ اسی نظام کے تحت خود اپنے اہتمام میں قومی مدرسے اور کالج اور یونیورسٹیاں قائم کریں جن میں طلبہ کو پڑھایا تو وہی کچھ جائے جو سرکاری

درس گاہوں میں پڑھایا جاتا ہے، اور انہیں تیار بھی اسی کام کے لیے کیا جائے جس کے لیے انگریز انہیں تیار کرنا چاہتا ہے، مگر ساتھ ساتھ دینیات کی تعلیم کا جوڑ بھی لگا دیا جائے، تاکہ وہ بالکل کافر ہی ہو کر نہ رہ جائیں۔

یہ ایک اصلاح کی تجویز تھی اور خیال یہ کیا گیا تھا کہ اس طریقے سے ہم اُن مسلمان نوجوانوں کو جو ہمارے اداروں میں آکر پڑھیں گے، اُن بُرے اثرات سے کسی نہ کسی حد تک بچا سکیں گے جو انگریزی تعلیم سے پہنچنے کی توقع تھی۔ لیکن تجربے نے ثابت کر دیا، اور عقل سے بھی آپ سوچیں تو یہی آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ اس طرح کے قلم لگانے سے حقیقت میں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ پیوندی انسان تیار کرنے کی ایک عجیب کوشش تھی جو قطعاً ناکام ثابت ہوئی اور قانونِ فطرت کے مطابق اس کو ناکام ہونا ہی چاہیے تھا۔ ایک طرف آپ ایک طالب علم کو تمام دنیوی علوم اِس طریقے سے پڑھاتے ہیں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سارا کارخانہ بے خدا ہے اور خدا کے بغیر چل رہا ہے اور خوب کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ جو علم بھی وہ پڑھتا ہے اس کے اندر کہیں اس کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اِس کارخانۂ دنیا میں یا اس کارخانۂ زندگی میں کہیں خدا کا کوئی مقام ہے، کہیں رسول کا کوئی مقام ہے، کہیں وحی کی کوئی حاجت ہے۔ سارے کے سارے نظامِ زندگی کو وہ اِسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد یکایک آپ دینیات کی کلاس میں لے جا کر اس کو بتاتے ہیں کہ خدا بھی ہے اور رسول بھی ہے اور وحی بھی آتی ہے اور کتابیں بھی آتی ہیں۔ آپ خود غور کیجیے کہ دنیا کے مجموعی تصور سے الگ اور بالکل بے تعلق کر کے یہ اطلاع جو آپ اس کو دے رہے ہیں اِس کو وہ اس مجموعے میں آخر کہاں نصب کرے گا؟ کس طرح آپ ہر طالب علم سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ کائنات اور زندگی کے بے خدا تصور کے ساتھ دینیات کی یہ پوٹلی جو آپ الگ سے اس کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں، اسے وہ کھول کر روز کے روز اپنے دوسرے اجزائے علم کے ساتھ ترکیب دیتا رہیگا اور خود بخود اپنے ذہن میں ایک دوسرا باخدا تصور مرتب کرتا رہے گا؟

پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے قومی خرچ پر جو درس گاہیں قائم کیں ان میں بھی ہم نے مذہبی سارا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جو سرکاری درسگاہوں میں تھا۔ ہم نے

کوشش کی کہ ہمارے طلبہ انگریزی بولیں اور انگریزی لباس پہنیں۔ ہم نے کوشش کی کہ وہ انگریزی کلچر ہی کے رنگ میں رنگے جائیں۔ ہم نے کھیلوں میں اور نشست و برخاست میں اور رہنے سہنے میں اور مسائل پر مباحثوں میں، غرض ہر چیز میں یہی کوشش کی کہ ہماری یہ قومی درسگاہیں کسی طرح بھی سرکاری درسگاہوں سے مختلف نہ ہوں۔ بالکل اُسی معیار کے آدمی یہاں سے نکلیں جیسے سرکاری درسگاہوں سے نکلتے ہیں اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ انگریزی معیار کے لحاظ سے سرکاری درسگاہوں سے نکلے ہوئے لوگوں سے کسی طرح بھی کم تر ہیں۔ جب یہ مقصد ہمارے سامنے تھا اور اسی کی خاطر ہم نے پورا فرنگیت کا ماحول جاری کرنے کی کوشش کی، تو اس ماحول کے اندر اسلام کی وہ ذرا سی قلم جو ہم نے لگائی وہ آخر اپنا کیا رنگ دکھا سکتی تھی تعلیمی حیثیت سے وہ نہایت کمزور تھی۔ دوسرے کسی نصابِ تعلیم سے اس کا کوئی جوڑ نہ تھا جتنے دلائل ایسے ہو سکتے تھے جو خدا پرستی کے لیے کار آمد ہوتے، وہ سارے کے سارے دلائل ہم نے ناخدا پرستی اور ناخدا شناسی کے لیے فراہم کر کے دیئے۔ اس پر مزید ستم ہم نے یہ کیا کہ اپنے قومی کالجوں میں بھی سرکاری کالجوں کی طرح زندگی کا پورا ماحول اور ذہنی تربیت کا پورا انتظام ایسا رکھا جو اسلام کے اس کمزور سے پیوند کے بجائے فرنگیت اور الحاد کے لیے ہی سازگار تھا۔ اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو اس پیوند کو غذا دینے والی ہو، بلکہ ہر چیز علی الرغم اس کی فطرت کے خلاف تھی۔ یہ سب کچھ کر کے ہم اس معجزے کی توقع رکھتے تھے کہ دینیات کی اس تعلیم سے حقیقت میں کوئی دینی جذبہ پیدا ہو گا، کوئی دینی رجحان نشو و نما پائے گا، اسلام کی قدر و قیمت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو گی اور ان کے اندر اسلامی کیریکٹر پیدا ہو گا۔ حالانکہ قانونِ فطرت کے مطابق اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا اور یہی عملاً برآمد ہوا کہ جن طلبہ کو اس طریقے سے دینیات کی تعلیم دی گئی ان کی نگاہوں سے دین گر گیا اور ان کی دینی حالت مشن کالجوں اور گورنمنٹ کالجوں کے طلبہ سے بھی زیادہ بدتر ہو گئی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے کالجوں میں بالعموم دینیات کا گھنٹہ تفریح اور مذاق کا گھنٹہ رہا ہے اور اس نے دلوں میں ایمان پیدا کرنے کے بجائے رہے سہے ایمان کا بھی خاتمہ کر دینے کی خدمت انجام دی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم خود اپنی اولاد کے سامنے اپنے دین کو تمام دوسرے مضامین سے حقیر تر بنا کر پیش کریں گے تو اس کی

کم سے کم سزا جو قدرت کی طرف سے ہمیں ملنی چاہیے وہ یہی ہے کہ ہمارے بچے ہماری آنکھوں کے سامنے ملحد اور زندیق بن کر اٹھیں اور اپنے اُن بزرگوں کو احمق سمجھیں جو خدا اور رسول اور آخرت کو مانتے تھے۔

اصلاح کی غلط تدبیریں یہ نتائج آج سے ۱۷-۱۸ برس پہلے پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہو چکے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ۳۴ء یا ۳۵ء کے زمانے میں یکایک یہ شور برپا ہُوا تھا کہ آخر ہماری قومی درسگاہوں سے ملاحدہ اور الحاد و دہریت کے مبلغین اس کثرت سے کیوں پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ شکایت خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں تھی جہاں عام اندازے کے مطابق نوّے فیصدی طلبہ الحاد اور دہریت میں مبتلا تھے۔ جب یہ واقعات پھیلنے شروع ہوئے اور سارے ملک میں اس کے متعلق مضامین لکھے جانے لگے تو ایک کمیٹی بٹھائی گئی جس نے اس مسئلے پر غور کیا۔ اُس وقت یہ خیال قائم کیا گیا کہ دینیات کے عنصر کو پہلے کی بہ نسبت کچھ زیادہ کر دینے سے کام چل جائیگا۔ چنانچہ اس سلسلے میں کچھ اصلاحات تجویز کی گئیں اور کچھ نئے نصاب بھی مرتب کیے گئے۔ لیکن یہ اصلاح کچھ بھی مفید ثابت نہ ہوئی اور اُس وقت سے آج تک صورت حال میں کوئی فرق رونما نہیں ہُوا۔

میرا اُسی وقت یہ اندازہ تھا اور مَیں نے "ترجمان القرآن" میں اسے لکھ بھی دیا تھا کہ ان تدبیروں سے آپ کوئی مفید نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ آج مَیں اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ ہمارے اربابِ اقتدار، جن کے ہاتھ میں ہمارا نظامِ تعلیم ہے اور جو وقتاً فوقتاً ہمیں اسلامی نظامِ تعلیم کے قیام کی خوشخبری سناتے رہتے ہیں، اسی غلطی کا پھر اعادہ کرتے نظر آ رہے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر بھی حقیقت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہاں وہی پُرانا طرزِ تعلیم، جو انگریز کے وقت سے چلا آ رہا ہے، اُسی طرح قائم رہے اور اس کے اندر بس دینیات کے عنصر کو ذرا بڑھا دیا جائے۔ اس لیے جو بات مَیں نے آج سے چند برس پہلے کہی تھی، آج پھر میں اس کو دُہراتا ہوں۔ میرے نزدیک اس سے بڑی دنیا میں کوئی غلطی نہیں ہے کہ کسی نظامِ تعلیم میں دو بالکل متضاد عناصر شامل کر دیے جائیں، ایسے متضاد عناصر جو ایک دوسرے کے ساتھ مزاحمت کرنے والے اور ایک دوسرے کی تردید کرنے والے ہوں۔ اس طرح کی آمیزش فسادِ ذہنی کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

فرض کیجیے کہ اس آمیزے میں آپ نے دینی تعلیم کے عنصر کو پچاس فیصدی کر دیا اور باقی پچاس فی صدی آپ کی تعلیم انہی بنیادوں پر رہی جن پر انگریز یہاں قائم کر گیا ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر طالب علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا۔ بلکہ ہر طالب علم کی زندگی ایک رزمگاہ بن جائے گی۔ پھر اگر آپ نے اپنے کالجوں میں، جہاں تک کہ تعلیمی نصاب کا تعلق ہے، دینیات کا عنصر پچاس فی صدی بھی رکھ دیا، مگر سارا تعلیمی ماحول اور آپ کے کالجوں کی ساری فضا ویسی کی ویسی ہی فرنگیانہ رہی جیسی کہ انگریز کے دور میں تھی، اور یہ آپ کی مملکت بھی انہی بنیادوں پر چلتی رہی جن پر انگریز اس کو قائم کر گیا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی درسگاہوں سے تین قسم کے آدمی نکلیں گے۔

ایک قسم کے آدمی تو وہ ہونگے جو دینیات کی تعلیم پانے کے باوجود پھر بھی ملحد ہوں گے، کیونکہ ایک دوسرا مخالف عنصر بھی آپ کے نظامِ تعلیم میں موجود ہوگا اور اس کی پشت پر نہ صرف کالج کے ماحول کی طاقت ہوگی بلکہ آپ کی مملکت کا ماحول بھی اسی کے لیے مددگار ہوگا اور مزید براں دنیا کی طاقتور سلطنتوں کا بین الاقوامی ماحول بھی اسی کے لیے سازگار رہیگا۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہونگے جو دینیات کی تعلیم کا اثر قبول کر کے اسلام ہی کو اپنے دین کی حیثیت سے پسند کریں گے۔

اور تیسری قسم کے لوگ ایسے نکلیں گے جو اسلام اور کفر کے درمیان مذبذب رہیں گے۔ نہ پورے مسلمان ہی ہونگے نہ پورے کافر۔

یہ ہیں اس طرح کی آمیزشیں کرنے کے لازمی نتائج۔ آپ اگر اس کا تجربہ کریں گے تو خود دیکھ لیں گے کہ اس سے آپ کی قوم میں تین مختلف قسم کے عناصر پیدا ہو جائیں گے جو کسی تہذیب اور کسی نظامِ زندگی کو بھی نشوونما دینے میں یکسوئی کے ساتھ تعاون نہ کر سکیں گے۔ پھر کیا ایک ملک کا نظامِ تعلیم اسی غرض کے لیے بنایا جاتا ہے کہ وہ ملک میں ایک ذہنی کباڑ خانہ فراہم کرے؟

ایک انقلابی قدم کی ضرورت | یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے میرا مقصد یہ بات ذہن نشین کرانا ہے کہ اگر فی الواقع ہم یہاں ایک اسلامی نظامِ تعلیم قائم کرنا چاہتے ہیں تو محض مرتبین اور دماغ و دزیاں

کرنے سے کام نہیں چل سکتا، بلکہ اس کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظامِ تعلیم ختم کر دیے جائیں جو اب تک ہمارے ہاں رائج رہے ہیں۔ پرانا مذہبی نظامِ تعلیم بھی ختم کیا جائے اور یہ موجودہ نظامِ تعلیم بھی جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک نیا نظامِ تعلیم بنانا چاہیے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری اُن ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم، اور ایک آزاد قوم، اور ایک ترقی کی خواہشمند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں۔ اسی نظامِ تعلیم کا نقشہ اور اس کے قائم کرنے کا طریقہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مقصد کا تعیّن اس نئے نظامِ تعلیم کی تشکیل میں اوّلین چیز جسے ہم کو سب سے پہلے طے کرنا چاہیے یہ ہے کہ ہمارے پیشِ نظر مقصد کیا ہے؟ بعض لوگوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد بس علم حاصل کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو بالکل ایک غیر جانب دارانہ تعلیم دی جانی چاہیے تاکہ وہ زندگی کے مسائل اور معاملات اور حقائق کا بالکل ایک معروضی مطالعہ (Objective Study) کریں اور آزادانہ نتائج اخذ کر سکیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس طرح کا معروضی مطالعہ صرف فوٹو کے کیمرے کیا کرتے ہیں، انسان نہیں کر سکتے۔ انسان ان آنکھوں کے پیچھے ایک دماغ بھی رکھتا ہے جو بہرحال اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے، زندگی میں اپنا ایک مقصد رکھتا ہے، مسائل کے متعلق سوچنے کا ایک طرز رکھتا ہے اور وہ جو کچھ بھی سنتا ہے، جو کچھ بھی معلومات حاصل کرتا ہے اسے اپنی اُس فکر کے سانچے میں ڈھالتا جاتا ہے جو اس کے اندر بنیادی طور پر موجود ہوتی ہے۔ پھر اسی فکر کی بنیاد پر اس کا وہ نظامِ زندگی قائم ہوتا ہے جس کو ہم اس کی کلچر کہتے ہیں۔ اب اگر ہم اپنی ایک کلچر رکھتے ہیں اور ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں، جس کا اپنا ایک نظریۂ زندگی ہے، جس کا اپنا ایک نصب العین ہے، اور جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے، تو لازماً ہمیں اپنی نئی نسلوں کو اس غرض کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ وہ ہماری اس کلچر کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھیں بلکہ آگے اُنہی بنیادوں پر اسے ترقی دیں جن پر ہماری کلچر قائم ہے۔ دنیا کی ہر قوم اسی غرض کے لیے اپنا مستقل نظامِ تعلیم قائم کیا کرتی ہے۔ مجھے کوئی قوم ایسی معلوم نہیں

ہے جس نے اپنا نظامِ تعلیم خالص معروضی بنیادوں پر قائم کیا ہو اور اپنی نسلوں کو بے رنگ تعلیم دینے کی کوشش کی ہو۔ اسی طرح مجھے ایسی بھی کوئی قوم معلوم نہیں ہے جو دوسروں سے ان کا نظامِ تعلیم جوں کا توں لے لیتی ہو اور اپنی تہذیب کا کوئی رنگ اس میں شامل کیے بغیر اسی کے سانچے میں اپنی نئی نسلوں کو ڈھالتی چلی جاتی ہو۔ یہ حماقت اگر پہلے ہم کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے کر رہے تھے تو اب اسے حسبِ سابق جاری رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔ اب تو ہمارا نظامِ زندگی ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اب لازماً ہمارے پیشِ نظر تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ہم ایسے افراد تیار کریں جو ہماری قومی تہذیب کو ——— اور ہماری قومی تہذیب ہمارے دین کے سوا اور کیا ہے؟ لہٰذا ہمارے دین کو ——— اچھی طرح سمجھتے ہوں، اس پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوں، اس کے اصولوں کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں، اس کے مطابق مضبوط سیرت اور قابلِ اعتماد اخلاق رکھتے ہوں، اور اس قابلیت کے مالک ہوں کہ ہماری اجتماعی زندگی کے پورے کارخانے کو ہماری اسی تہذیب کے اصولوں پر چلا سکیں اور مزید ترقی دے سکیں۔

دین و دنیا کی تفریق مٹا دی جائے دوسری چیز جو ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں بطورِ اصول کے پیشِ نظر رکھنی چاہیے اور اسی کی بنیاد پر ہمارا سارا نظامِ تعلیم بننا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اس دین اور دنیا کی تفریق کو ختم کر دیں۔ دین اور دنیا کی تفریق کا تخیل ایک عیسائی تخیل ہے، یا بدھ مذہب یا ہندوؤں اور جوگیوں کا ہے۔ اسلام کا تخیل اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لیے اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم میں، اپنے نظامِ تمدن میں اور اپنے نظامِ مملکت میں اس دین اور دنیا کی تفریق کے تخیل کو قبول کریں۔ ہم اس کے بالکل قائل نہیں ہیں کہ ہماری ایک تعلیم دنیوی ہو اور ایک تعلیم دینی۔ اس کے برعکس ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری پوری کی پوری تعلیم بیک وقت دینی بھی ہو اور دنیوی بھی۔ دنیوی اس لحاظ سے کہ ہم دنیا کو سمجھیں اور دنیا کے کام چلانے کے قابل ہوں۔ اور دینی اس لحاظ سے کہ ہم دنیا کو دین ہی کے نقطۂ نظر سے سمجھیں اور دین کی ہدایت کے مطابق اس کا سارا کام چلائیں۔ اسلام وہ مذہب نہیں ہے جو آپ سے یہ کہتا ہو کہ دنیا کے کام آپ جس طرح چاہیں چلاتے رہیں اور بس اس کے ساتھ چند عقائد اور عبادات کا ضمیمہ لگائے رہیں۔ اسلام زندگی کا محض ایک ضمیمہ بننے پر

نہ کبھی قانع تھا اور نہ آج ہے۔ وہ تو پوری زندگی میں آپ کا رہنما اور پوری زندگی کے لیے آپ کا طریق عمل بننا چاہتا ہے۔ وہ دنیا سے الگ محض عالم بالا کی باتیں نہیں کرتا بلکہ پوری طرح دنیا کے مسئلے سے بحث کرتا ہے۔ وہ آپ کو بتاتا ہے کہ اس دنیا کی حقیقت کیا ہے۔ اس دنیا میں آپ کس غرض کے لیے آئے ہیں۔ آپ کا مقصدِ زندگی کیا ہے۔ کائنات میں آپ کی اصلی پوزیشن کیا ہے۔ اور اس دنیا میں آپ کو کس طریقے سے، کن اصولوں پر کام کرنا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ آخرت میں جو کچھ بھی آپ کو پھل ملنے والے ہیں وہ اس بات پر منحصر ہیں کہ دنیا کی اس کھیتی میں آپ کیا بوتے ہیں۔ اس کھیتی کے اندر زراعت کرنا وہ آپ کو سکھاتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں آپ کا سارا طرزِ عمل کیا ہو جس کے نتیجے میں آپ کو آخرت کا پھل ملے۔ اس قسم کا ایک دین کیسے یہ بات گوارا کر سکتا ہے کہ آپ کے ہاں ایک تعلیم دنیوی ہو اور دوسری دینی، یا ایک دنیوی تعلیم کے ساتھ محض ایک مذہبی ضمیمہ لگا دیا جائے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ آپ کی پوری کی پوری تعلیم دینی نقطۂ نظر سے ہو۔ اگر آپ فلسفہ پڑھیں تو دینی نقطۂ نظر سے پڑھیں تاکہ آپ ایک مسلمان فلاسفر بن سکیں۔ آپ تاریخ پڑھیں تو ایک مسلمان کے نقطۂ نگاہ سے پڑھیں تاکہ آپ ایک مسلمان مؤرخ بن سکیں۔ آپ سائنس پڑھیں تو ایک مسلم سائنٹسٹ بن کر اٹھیں۔ آپ معاشیات پڑھیں تو اس قابل بنیں کہ اپنے ملک کے پورے معاشی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ آپ سیاسیات پڑھیں تو اس لائق بنیں کہ اپنے ملک کا نظامِ حکومت اسلام کے اصولوں پر چلا سکیں۔ آپ قانون پڑھیں تو اسلام کے معیارِ عدل و انصاف پر معاملات کے فیصلے کرنے کے لائق ہوں۔ اس طرح اسلام دین و دنیا کی تفریق مٹا کر پوری کی پوری تعلیم کو دینی بنا دینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد کسی جداگانہ مذہبی نظامِ تعلیم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ کے یہی کالج آپ کے لیے امام اور مفتی اور علمائے دین بھی تیار کریں گے اور آپ کی قومی حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لیے سکرٹری اور ڈائرکٹر بھی۔

تشکیلِ سیرت تیسری بنیادی چیز جو نئے نظامِ تعلیم میں ملحوظ رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس میں تشکیلِ سیرت کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ محض کتابیں پڑھانے اور محض علوم و فنون

سکھا دینے سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے ایک ایک نوجوان کے اندر اسلامی کیرکٹر پیدا ہو، اسلامی سیرت اور اسلامی ذہنیت پیدا ہو۔ خواہ وہ انجینئر ہو، خواہ وہ سائنٹسٹ ہو، خواہ وہ علومِ عمران کا ماہر ہو، خواہ وہ ہماری سول سروس کے لیے تیار ہو رہا ہو، جو بھی ہو اس کے اندر اسلامی ذہنیت اور اسلامی کیرکٹر ضرور ہونا چاہیے۔ یہ چیز ہماری تعلیمی پالیسی کے بنیادی مقاصد میں شامل ہونی چاہیے۔ جس آدمی میں اسلامی اخلاق نہیں وہ چاہے جو کچھ بھی ہو، بہر حال ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔

عملی نقشہ ان اصولی باتوں کی وضاحت کے بعد اب میں تفصیل کے ساتھ یہ بتاؤں گا کہ وہ اسلامی نظامِ تعلیم جس کو ہم یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کا عملی نقشہ کیا ہے۔

ابتدائی تعلیم سب سے پہلے ابتدائی تعلیم کو لیجیے جو اس عمارت کی بنیاد ہے۔ اس تعلیم میں وہ سب مضامین پڑھائیے جو آج آپ کے پرائمری اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں، اور دنیا بھر میں ابتدائی تعلیم کے متعلق جتنے تجربات کیے گئے ہیں اور آئندہ کیے جائیں ان سب سے فائدہ اٹھائیے، لیکن چار چیزیں ایسی ہیں جو اس کے ہر مضمون میں پیوست ہونی چاہئیں:

اوّل یہ کہ بچے کے ذہن میں ہر پہلو سے یہ بات بٹھائی جائے کہ یہ دنیا ایک خدا کی سلطنت اور ایک خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہاں ہم خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے خدا کی امانت ہے جو ہمارے حوالے کی گئی ہے۔ اس امانت کے معاملے میں ہم خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ یہاں ہر طرف جدھر بھی نگاہ ڈالی جائے خدا کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ ایک حکمراں ہے جو ان سب پر حکومت کر رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لیے جس وقت بچہ داخل ہو اس وقت سے لے کر پرائمری اسکول کے آخری مرحلہ تک دنیا سے اس کو آشنا اور روشناس ہی اس طرز پر کیا جاتا رہے کہ ہر سبق کے اندر یہ تصورات شامل ہوں۔ حتیٰ کہ وہ الف سے ایٹم بم نہ سیکھے بلکہ اللہ سیکھے۔ یہ وہ چیز ہے جو بچوں میں اوّل روز سے اسلامی ذہنیت پیدا کرنی شروع کر دے گی اور ان کو اس طرح سے تیار کرے گی کہ آخری مراحل

تعلیم تک جبکہ وہ ڈاکٹر بنیں گے یہی بنیاد اور یہی جڑ کام دیتی رہے گی۔

دوم یہ کہ اسلام جن اخلاقی تصورات اور اخلاقی اقدار کو پیش کرتا ہے انہیں ہر مضمون کے اسباق میں حتیٰ کہ حساب کے سوالات تک میں طرح طرح سے بچوں کے ذہن نشین کیا جائے۔ وہ جن چیزوں کو نیکی اور بھلائی کہتا ہے ان کی قدر اور ان کے لیے رغبت اور شوق بچوں کے دل میں پیدا کیا جائے۔ اور وہ جن کو برائی قرار دیتا ہے ان کے لیے ہر پہلو سے بچوں کے دل میں نفرت بٹھائی جائے۔ آج ہماری قوم میں جو لوگ رشوتیں کھا رہے ہیں، جو لوگ بددیانتیاں اور خیانتیں کر رہے ہیں وہ سب انہی درسگاہوں سے پڑھکر نکلے ہیں اور آگے جا کر وہی اپنی قوم کے ساتھ یہ کچھ بے ایمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو طوطے مینا اور گائے بیل کے سبق پڑھائے گئے تھے، اخلاقی سبق نہیں پڑھائے گئے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہر طالب علم کو جو تعلیم دی جائے اس کے اندر اخلاقی مضامین شامل ہوں۔ اس کے اندر رشوت خوری کے خلاف شدید جذبۂ نفرت ابھارا جائے۔ اس کے اندر حرام طریقوں سے مال کمانے اور کھانے والوں پر سخت تنقید کی جائے اور اس کے برے نتائج بچوں کے ذہن نشین کیے جائیں۔ اس کے اندر جھوٹ سے، دھوکے اور فریب سے، خود غرضی اور نفس پرستی سے، چوری اور جعل سازی سے، بدعہدی اور خیانت سے، شراب اور سود اور قمار بازی سے، ظلم اور بے انصافی اور لوگوں کے حق مارنے سے سخت نفرت بٹھائی جائے اور بچوں کے اندر ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ جس شخص میں بھی وہ ان اخلاقی برائیوں کا اثر پائیں اس کو بری نگاہ سے دیکھیں اور اس کے متعلق برے خیالات کا اظہار کریں۔ یہاں تک کہ انہی درسگاہوں سے فارغ ہو کر اگر آگے کوئی شخص ایسا نکلے جو ان برائیوں میں مبتلا ہو تو اس کے اپنے ساتھی اس کو لعنت ملامت کرنے والے ہوں نہ کہ داد دینے اور ساتھ دینے والے۔ اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ نیکیاں جن کو اسلام انسان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے، ان کو درسیات میں بیان کیا جائے، اُن کی طرف رغبت دلائی جائے، اُن کی تعریف کی جائے، ان کے اچھے نتائج تاریخ سے نکال نکال کر بتلائے جائیں اور عقل سے ان کے فائدے سمجھائے جائیں کہ یہ نیکیاں

حقیقت میں انسانیت کے لیے مطلوب ہیں اور انسانیت کی بھلائی انہی کے اندر ہے۔ بچوں کو دل نشین طریقے سے بتایا جائے کہ وہ اصلی خوبیاں کیا ہیں جو ایک انسان کے اندر ہونی چاہئیں، اور ایک بھلا آدمی کیسا ہوا کرتا ہے۔ اس میں ان کو صداقت اور دیانت کا، امانت اور پاسِ عہد کا، عدل و انصاف اور حق شناسی کا، ہمدردی اور اخوت کا، ایثار اور قربانی کا، فرض شناسی اور پابندیٔ حدود کا، اکلِ حلال اور ترکِ حرام کا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کھلے اور چھپے ہر حال میں خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرنے کا سبق دیا جائے، اور عملی تربیت سے بھی اس امر کی کوشش کی جائے کہ بچوں میں یہ اوصاف نشوونما پائیں۔

سوم یہ کہ ابتدائی تعلیم میں ہی اسلام کے بنیادی حقائق اور ایمانیات بچوں کے ذہن نشین کرا دیے جائیں۔ اس کے لیے اگر ایک الگ دینیات کے کورس کی ضرورت محسوس ہو تو وہ بنایا جا سکتا ہے، لیکن بہرحال صرف اسی ایک کورس پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان ایمانیات کو دوسرے تمام مضامین میں بھی روحِ تعلیم کی حیثیت سے پھیلا دیا جائے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہر مسلمان بچے کے دل میں توحید کا عقیدہ، رسالت کا عقیدہ، آخرت کا عقیدہ، قرآن کے برحق ہونے کا عقیدہ، شرک اور کفر اور دہریت کے باطل ہونے کا عقیدہ پوری قوت کے ساتھ بٹھا دیا جائے۔ اور یہ تلقین ایسے طریقے سے ہونی چاہیے کہ بچہ یہ نہ محسوس کرے کہ یہ کچھ دعوے اور کچھ تحکمات ہیں جو اس سے منوائے جا رہے ہیں، بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ یہی کائنات کی معقول ترین حقیقتیں ہیں، ان کا جاننا اور ماننا انسان کے لیے ضروری ہے، اور ان کو مانے بغیر آدمی کی زندگی درست نہیں ہو سکتی۔

چہارم یہ کہ بچے کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے جائیں اور اس سلسلے میں وہ تمام فقہی مسائل بیان کر دیے جائیں جو ایک دس برس کے لڑکے اور لڑکی کو معلوم ہونے چاہئیں۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام، وضو کے مسائل، نماز اور روزے کے طریقے، حرام اور حلال کے ابتدائی حدود، والدین اور رشتہ داروں اور ہمسایوں کے حقوق، کھانے پینے کے آداب، لباس کے حدود، معاشرتی زندگی کے پسندیدہ اطوار، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہئیں۔ ان کو صرف بیان ہی

نہ کیا جائے بلکہ ایسے طریقے سے ذہن نشین کیا جائے جس سے بچے یہ سمجھیں کہ ہمارے لیے یہی احکام ہونے چاہییں، یہ احکام بالکل برحق ہیں، اور ہم کو ایک ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لیے ان احکام کا پابند ہونا چاہیے۔

ثانوی تعلیم اس کے بعد اب ہائی سکول کی تعلیم کو لیجیے۔ اس میں سب سے پہلی چیز جسے میں ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ عربی زبان کو بطور لازمی زبان پڑھایا جائے۔ اسلام کے اصل ماخذ سارے کے سارے عربی زبان میں ہیں۔ قرآن عربی میں ہے۔ حدیث عربی میں ہے۔ ہمارے ابتدائی صدیوں کے فقہاء اور علماء نے جتنا کام کیا ہے ان کی ساری کتابیں بھی عربی زبان میں ہیں۔ اسلامی تاریخ کے اصل ماخذ بھی عربی زبان ہی میں ہیں۔ کوئی شخص اسلام کی سپرٹ پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتا اور نہ پوری طرح سے اس میں اسلامی ذہنیت پیوست ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ قرآن کو براہِ راست اس کی اپنی زبان میں نہ پڑھے۔ محض ترجموں سے کام نہیں چلتا۔ اگرچہ ہم چاہتے ہیں کہ ترجمے بھی پھیلیں تاکہ ہمارے عوام الناس کم از کم یہ جان لیں کہ ہمارا خدا ہمیں کیا حکم دیتا ہے لیکن ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو عربی زبان سے ناواقف ہو۔ اس لیے ہم عربی کو بطور ایک لازمی مضمون کے شامل کرنا چاہتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک شخص جب ہائی سکول سے خارج ہو کر نکلے تو اس کو اتنی عربی آتی ہو کہ وہ ایک سادہ عربی عبارت کو صحیح پڑھ اور سمجھ سکے۔

ثانوی تعلیم کا دوسرا لازمی مضمون قرآن مجید ہونا چاہیے جس کے کم از کم دو پارے ہر میٹرک پاس طالب علم اچھی طرح سمجھ کر پڑھ چکا ہو۔ وقت بچانے کے لیے ایسا کیا جا سکتا ہے کہ ہائی اسکول کے آخری مرحلوں میں عربی زبان قرآن ہی کے ذریعے سے پڑھائی جائے۔

تیسرا لازمی مضمون اسلامی عقائد کا ہونا چاہیے جس میں طلبہ کو نہ صرف ایمانیات کی تفصیل سے آگاہ کیا جائے بلکہ انھیں یہ بھی بتایا جائے کہ ہمارے پاس ان عقائد کے دلائل کیا ہیں، انسان کو ان کی ضرورت کیا ہے، انسان کی عملی زندگی سے ان کا ربط کیا ہے، ان کے ماننے یا نہ ماننے کے کیا اثرات انسانی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں، اور ان عقائد پر ایمان لانے کے اخلاقی اور عملی تقاضے

کیا ہیں۔ یہ امور ایسے طریقے سے طلبہ کے ذہن نشین کیے جانے چاہئیں کہ وہ محض باپ دادا کے مذہبی عقائد ہونے کی حیثیت سے ان کو نہ مانیں بلکہ یہ ان کی اپنی رائے بن جائیں۔

اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاقیات کو بھی ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت ثانوی تعلیم میں زیادہ تفصیل اور تشریح کے ساتھ بیان کیا جائے اور تاریخ سے نظیریں پیش کر کرکے یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ اسلام کے یہ اخلاقیات محض خیالی اصول اور نظریے نہیں ہیں بلکہ عملاً اس سیرت و کردار کے لوگ مسلم سوسائٹی میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ میں ایک ایسی رائے عام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام جن اوصاف کی مذمت کرتا ہے، طلبہ خود ان اوصاف کو بُرا سمجھیں، ان سے بچیں اور اپنی سوسائٹی میں اُن صفات کے لوگوں کو اُبھرنے نہ دیں۔ اور اسلام جن اوصاف کو محمود اور مطلوب قرار دیتا ہے ان کو وہ خود پسند کریں، ان کو اپنے اندر نشوونما دیں اور ان کی سوسائٹی میں انہی اوصاف کے لوگوں کی ہمت افزائی ہو۔

میٹرک کے معیار تک پہنچتے پہنچتے ایک بچہ جوان ہو چکا ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اس کو اسلامی زندگی کے متعلق ابتدائی تعلیم کی بہ نسبت زیادہ تفصیلی احکام جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں اس کو شخصی اور ذاتی زندگی، خاندانی زندگی، اور تمدن و معاشرت اور لین دین وغیرہ کے متعلق اُن تمام ضروری احکام سے واقف ہونا چاہیے جو ایک جوان آدمی کے لیے درکار ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ان احکام کو اتنی تفصیل کے ساتھ جانے کہ مفتی بن جائے، لیکن اس کی معلومات اتنی ضرور ہونی چاہئیں کہ وہ اُس معیار کی زندگی بسر کر سکے جو ایک مسلمان کا معیار ہونا چاہیے۔ یہ کیفیت تو نہ ہو کہ ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی نکاح و طلاق کے متعلق کوئی علم نہیں ہوتا اور بسا اوقات وہ شدید غلطیاں کر جاتے ہیں اور پھر مسئلے پوچھتے پھرتے ہیں۔ یا لین دین کے متعلق معمولی مسائل سے بھی ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ناواقف ہوتے ہیں اور اسلامی احکام کے مطابق چلنے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس لیے غلطیاں کرتے ہیں کہ ان کو احکام معلوم نہیں ہوتے۔

تاریخ کی تعلیم میں ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہائی اسکول کا ہر طالب علم نہ صرف اپنے

ملک کی تاریخ پڑھے بلکہ اسلام کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ اس کو تاریخ انبیاء سے واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ یہ جان لے کہ اسلام ایک ازلی و ابدی تحریک ہے، ساتویں صدی عیسوی میں یکایک شروع نہیں ہوگئی تھی۔ اس کو سیرت نبوی اور سیرت خلفائے راشدین سے بھی واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ اُن مثالی شخصیتوں سے روشناس ہو جائے جو اس کے لیے معیار انسانیت کا درجہ رکھتی ہیں خلافت راشدہ کے بعد سے اب تک کی تاریخ کا بھی ایک مجمل خاکہ اس کے سامنے آجانا چاہیے تاکہ وہ یہ جان لے کہ مسلمان قوم کن کن مراحل سے گزرتی ہوئی موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ یہ تاریخی معلومات نہایت ضروری ہیں۔ جس قوم کے نوجوانوں کو خود اپنے ماضی کا علم نہ ہو اس کے اندر اپنی قومی تہذیب کا احترام کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس تعلیم کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہائی اسکول کے مرحلے میں طلبہ کی عملی تربیت کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے۔ مثلاً ہائی سکول میں کوئی مسلمان طالب علم ایسا نہیں ہونا چاہیے جو نماز کا پابند نہ ہو۔ طلبہ کے اندر ایسی رائے عام پیدا کی جانی چاہیے کہ وہ اپنے درمیان ایسے طالبعلموں کو برداشت نہ کریں جو نماز کے پابند نہ ہوں۔ اور از روئے قاعدہ بھی کوئی ایسا طالب علم مدرسے میں نہ رہ سکے جو مدرسے کے اوقات میں نماز نہ پڑھتا ہو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ نماز ہی وہ بنیاد ہے جس پر عملاً اسلامی زندگی قائم ہوتی ہے۔ یہ بنیاد منہدم ہو جانے کے بعد اسلامی زندگی ہرگز قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لحاظ سے بھی آپ کو سوچنا چاہیے کہ ایک طرف آپ ایک طالب علم کو یہ بتاتے ہیں کہ نماز فرض ہے، یہ خدا نے تجھ پر فرض کی ہے۔ اس کے بعد آپ اپنے عملی برتاؤ سے روز یہ بات اس کے ذہن نشین کرتے ہیں کہ اس فرض کو فرض جانتے اور مانتے ہوئے بھی اگر تو ادا نہ کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آپ اسے روزانہ منافقت کی اور ڈیوٹی سے فرار کی اور ضعف سیرت کی مشق کرا رہے ہیں۔ کیا آپ امید رکھتے ہیں کہ یہ تعلیم و تربیت پا کر جب وہ نکلے گا تو آپ کے تمدن اور آپ کی ریاست کا ایک فرض شناس کارکن ثابت ہوگا؟ جی نہیں، ایک فرض کی چوری میں مشاق ہو کر وہ پھر دوسرے فرائض میں سے چرلے گا۔ اسٹیٹ کے فرائض میں

سے چرائے گا۔ سوسائٹی کے فرائض میں سے چرائے گا۔ ہر فرض کے اندر سے کچھ نہ کچھ چوری کرکے رہیگا۔ اس صورت میں آپ کو اس سے ملامت نہ کرنی چاہیے بلکہ اس نظامِ تعلیم کو ملامت کرنی چاہیے جس نے اوّل روز سے اس کو یہ سکھایا تھا کہ فرض ایک ایسی چیز ہے جس کو فرض جاننے کے بعد بھی چھوڑا جاسکتا ہے۔ اپنے نوجوانوں کو خدا سے بے وفائی سکھانے کے بعد آپ یہ ہرگز امید نہ رکھیں کہ وہ قوم، ملک، ریاست، کسی چیز کے بھی مخلص اور وفادار ہونگے۔ تعلیم کے کورس میں بلند خیالات اور معیاری اوصاف بیان کرنے کا آخر فائدہ ہی کیا ہے اگر سیرت و کیرکٹر کو اُن خیالات اور معیارات پر قائم کرنے کی عملاً کوشش نہ کی جائے۔ دل میں اونچے خیالات رکھنے اور عمل ان کے خلاف کرنے سے رفتہ رفتہ سیرت کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہوجاتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی سیرت ہی بودی اور کھوکھلی ہو وہ مجرد اپنی ذہنی اور علمی قابلیتوں سے کوئی کارنامہ کرکے نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے ہمیں ثانوی تعلیم کے مرحلے میں، جبکہ نئی نسلیں بچپن سے جوانی کی سرحد میں داخل ہوتی ہیں، اس امر کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ایک ایک لڑکے اور لڑکی کے اندر مضبوط سیرت پیدا کریں اور انہیں یہ سکھائیں کہ تمہارا عمل تمہارے علم کے مطابق ہونا چاہیے۔ جس چیز کو حق جانو اس کی پیروی کرو۔ جسے فرض جانو اسے ادا کرو۔ جسے بھلائی جانو اسے اختیار کرو۔ اور جسے بُرا جانو اسے ترک کردو۔

اعلیٰ تعلیم | اس کے بعد میں اعلیٰ تعلیم کی طرف آتا ہوں۔ اس تعلیم میں ہم چاہتے ہیں کہ ایک عام نصاب ہو اور ایک خاص نصاب۔ عام نصاب سے میری مراد ایسا نصاب ہے جو تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو، خواہ وہ کسی مضمون کی تعلیم پا رہے ہوں، لازماً پڑھایا جائے۔ اور خاص نصاب کا مطلب وہ نصاب ہے جو ہر مضمون کے طالب علم کو اس کے مضمون کی مناسبت سے پڑھایا جائے۔

عام نصاب میں میرے نزدیک تین چیزیں شامل ہونی چاہئیں:

(۱) قرآن مجید، جسے اس طرح پڑھایا جائے کہ ایک طرف طلبہ قرآن کی تعلیمات سے بخوبی واقف ہوجائیں، اور دوسری طرف ان کی عربی اس حد تک ترقی کرجائے کہ وہ قرآن کو ترجمے کے بغیر اچھی طرح سمجھنے لگیں۔

(۲) حدیث کا ایک مختصر مجموعہ جس میں وہ احادیث جمع کی جائیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر، اس کی اخلاقی تعلیمات پر، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ مجموعہ بھی ترجمے کے بغیر ہونا چاہیے تاکہ طلبہ اس کے ذریعہ سے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی زبان دانی میں بھی ترقی کر سکیں۔

(۳) اسلامی نظام زندگی کا ایک جامع نقشہ، جس میں اسلام کی اعتقادی بنیادوں سے لے کر عبادات، اخلاق، معاشرت، تہذیب و تمدن، معیشت، سیاست، اور صلح و جنگ تک ہر پہلو کو وضاحت کے ساتھ معقول اور مدلل طریقہ سے بیان کیا جائے، تاکہ ہمارا ہر تعلیم یافتہ نوجوان اپنے دین کو اچھی طرح سمجھ لے، اور جس شعبۂ زندگی میں بھی وہ آگے کام کرے اس میں وہ اسلام کی اسپرٹ اس کے اصول اور اس کے احکام کو ملحوظ رکھ کر کام کر سکے۔

خاص نصاب ہر مضمون کی کلاسوں کے لیے الگ تیار کیا جائے اور وہ صرف اسی مضمون کے طلبہ کو پڑھایا جائے۔ مثلاً:

جو طلبہ فلسفہ لیں ان کو دوسرے فلسفیانہ نظاموں کے ساتھ اسلامی فلسفہ بھی پڑھایا جائے۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اسلامی فلسفے سے مراد وہ فلسفہ نہیں ہے جو مسلمانوں نے ارسطو اور افلاطون اور فلاطینوس وغیرہ سے لیا اور پھر اس کو انہی خطوط پر آگے بڑھایا۔ اور اس سے مراد وہ علم کلام بھی نہیں ہے جسے یونانی منطق و فلسفہ سے متاثر ہو کر ہمارے متکلمین نے اس غرض کے لیے مرتب کیا تھا کہ اسلامی حقائق کو اپنے وقت کے فلسفیانہ نظریات کی روشنی میں اور منطق کی زبان میں بیان کریں۔ یہ دونوں چیزیں اب صرف اپنی ایک تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ انہیں پڑھانا ضرور چاہیے مگر اس حیثیت سے کہ یہ تاریخ فلسفہ کے دو اہم ابواب ہیں جن کو مغربی مصنفین بالعموم نظرانداز کر کے طالبان علم کے ذہن پر یہ اثر جماتے رہے ہیں کہ دنیا کے عقلی ارتقاء میں قدیم یونانی فلاسفہ سے لے کر آج تک جو کچھ بھی کام کیا ہے صرف یورپ کے لوگوں نے کیا ہے۔ لیکن مسلمان فلاسفہ اور متکلمین کا یہ کام نہ "اسلامی فلسفہ" تھا، اور نہ اُسے اس نام سے آج ہمیں اپنے طلبہ کو پڑھانا چاہیے، ورنہ یہ سخت

غلط فہمی کا، بلکہ گمراہی کا موجب ہوگا۔" اسلامی فلسفہ" دراصل کہیں مرتب شدہ موجود نہیں ہے بلکہ اسے اب نئے سرے سے اُن بنیادوں پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہمیں قرآن میں ملتی ہیں۔ قرآن مجید ایک طرف انسانی علم و عقل کے حدود بتاتا ہے۔ دوسری طرف وہ محسوسات کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو تلاش کرنے کا صحیح راستہ بتاتا ہے۔ تیسری طرف وہ منطق کے ناقص طرزِ استدلال کو چھوڑ کر عقلِ عام کے مطابق ایک سیدھا سادھا طریقِ استدلال بتاتا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ وہ ایک پورا نظریۂ کائنات و انسان پیش کرتا ہے جس کے اندر ذہن میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ ان بنیادوں پر ایک نیا فنِ استدلال، ایک نیا طریقِ تفلسف، ایک نیا فلسفۂ مابعد الطبیعت، ایک نیا فلسفۂ اخلاق، اور ایک نیا علم النفس مرتب کیا جاسکتا ہے، جسے اب مرتب کرانے کی سخت ضرورت ہے تاکہ ہمارے فلسفے کے طلبہ فلسفۂ قدیم و جدید کی بھول بھلیاں میں داخل ہو کر پھنسنے کے پھنسے نہ رہ جائیں بلکہ اس سے نکلنے کا راستہ بھی پالیں اور دنیا کو ایک نئی روشنی دکھانے کے قابل بن سکیں۔

اسی طرح تاریخ کے طلبہ کو دنیا بھر کی تاریخ پڑھانے کے ساتھ اسلامی تاریخ بھی پڑھائی جائے، اور فلسفۂ تاریخ کے دوسرے نظریات کے ساتھ اسلام کے فلسفۂ تاریخ سے بھی روشناس کیا جائے۔ یہ دونوں مضمون بھی ذرا تشریح طلب ہیں، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کے بارے میں جو عام غلط فہمیاں موجود ہیں ان کی وجہ سے میرا مدعا آپ کے سامنے واضح نہ ہوگا۔ اسلامی تاریخ کا مطلب بالعموم مسلمان قوموں اور ریاستوں کی تاریخ، یا ان کے تمدن اور علوم و آداب کی تاریخ سمجھا جاتا ہے۔ اور اسلامی فلسفۂ تاریخ کا نام سن کر ہر ایک طالب علم ابن خلدون کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ میں علم تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان دونوں چیزوں کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کرتا، نہ یہ کہتا ہوں کہ یہ چیزیں پڑھائی نہ جائیں۔ مگر میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ دو الگ چیزیں ہیں۔ اسلامی تاریخ کا اطلاق دراصل جس چیز پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ کے دوران میں اسلام کے ان اثرات کا جائزہ لیا جائے جو مسلمان ہونے والی قوموں کے خیالات، علوم، آداب،

اخلاق، تمدن، سیاست، اور فی الجملہ پورے اجتماعی طرزِ عمل پر مترتب ہوئے، اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان اثرات کے ساتھ دوسرے غیر اسلامی اثرات کی آمیزش کس کس طرح ہوتی رہی ہے اور اس آمیزش کے کیا نتائج رونما ہوئے ہیں۔ اسی طرح اسلامی فلسفۂ تاریخ سے مراد درحقیقت قرآن کا فلسفۂ تاریخ ہے جس میں وہ ہمیں انسانی تاریخ کو دیکھنے کے لیے ایک خاص زاویۂ نگاہ دیتا ہے، اس سے نتائج اخذ کرنے کا ایک خاص ڈھنگ بتاتا ہے اور قوموں کے بننے اور بگڑنے کے اسباب پر مفصل روشنی ڈالتا ہے۔ افسوس ہے کہ اسلامی فلسفے کی طرح اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفۂ تاریخ پر بھی اس وقت تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے جو نصاب کے طور پر پڑھائی جا سکے۔ ان دونوں موضوعات پر اب کتابیں لکھنے اور لکھوانے کی ضرورت ہے تاکہ اُس خلا کو بھرا جا سکے جو ان کے بغیر ہماری تعلیمِ تاریخ میں رہ جائے گا۔

جہاں تک علومِ عمرانی کا تعلق ہے، ان میں سے ہر ایک میں اسلام کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے، اور ہر ایک میں وہ اپنے کچھ اصول رکھتا ہے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کی تعلیم میں اُس علم سے متعلق اسلامی تعلیمات کو بھی لازماً شامل ہونا چاہیے، مثلاً معاشیات میں اسلامی اصولِ معیشت، اور سیاسیات میں اسلام کا سیاسی نظریہ اور نظام، وغیرہ۔ رہے فنی علوم، مثلاً انجینئرنگ، طب اور سائنس کے مختلف شعبے، تو ان سے اسلام بحث نہیں کرتا، اس لیے ان میں کسی خاص اسلامی نصاب کی حاجت نہیں ہے۔ ان کے لیے وہی عام نصاب اور اخلاقی تربیت کافی ہے جس کا ابھی اس سے پہلے میں ذکر کر چکا ہوں۔

اختصاصی تعلیم | اعلیٰ تعلیم کے بعد اختصاصی تعلیم کو لیجیے جس کا مقصود کسی ایک شعبۂ علم میں کمال پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں جس طرح ہمارے ہاں دوسرے علوم و فنون کی اختصاصی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے، اسی طرح اب قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے علومِ اسلامیہ کی اختصاصی تعلیم کا بھی ہونا چاہیے تاکہ ہمارے ہاں اعلیٰ درجہ کے مفسر، محدث اور فقیہ اور علمائے دین پیدا ہو سکیں۔ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، اس کی تعلیم تو میرے خیال میں ہمارے لا کالجوں میں ہونی چاہیے۔

کیونکہ اب انشاء اللہ اسلام کا قانون ہی ہمارے ملک کا قانون بن کر رہے گا، اور اس صورت میں یہاں کے لاکالجوں کو یہی قانون پڑھانا ہوگا۔ اس کے لیے ہم کو تعلیم کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اس مسئلے پر اس سے پہلے میں اپنے دو لکچروں میں مفصل بحث کر چکا ہوں جو ۱۹۴۸ء میں لاکالج لاہور میں ہوئے تھے، اس لیے یہاں اس کا اعادہ نہ کروں گا۔[1] رہے قرآن وحدیث اور دوسرے علوم اسلامیہ، تو اُن کی اختصاصی تعلیم کے لیے ہماری یونیورسٹیوں کو خاص انتظامات کرنے ہونگے جن کا مختصر خاکہ میں یہاں پیش کرتا ہوں۔

میرے خیال میں اس مقصد کے لیے ہمیں مخصوص کالج قائم کرنے ہونگے جن میں صرف گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ داخل ہو سکیں۔ ان اداروں میں حسب ذیل مضامین کی تعلیم ہونی چاہیے:

(۱) عربی ادب، تاکہ طلبہ میں اعلیٰ درجے کی علمی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے کی استعداد پیدا ہو سکے اور اس کے ساتھ وہ عربی زبان لکھنے اور بولنے پر بھی قادر ہوں۔

(۲) علوم قرآن، جن میں پہلے اصول تفسیر، تاریخ علم تفسیر اور فن تفسیر کے مختلف اسکولوں کی خصوصیات سے طلبہ کو آشنا کیا جائے، اور پھر قرآن مجید کا تحقیقی مطالعہ کرایا جائے۔

(۳) علوم حدیث، جن میں اصول حدیث، تاریخ علم حدیث اور فنِ جرح و تعدیل پڑھانے کے بعد حدیث کی اصل کتابیں ایسے طریقے سے پڑھائی جائیں کہ طلبہ ایک طرف خود احادیث کو پرکھنے اور ان کی صحت و سقم کے متعلق رائے قائم کرنے کے قابل ہو جائیں، اور دوسری طرف حدیث کے بیشتر ذخیرے پر ان کو نظر حاصل ہو جائے۔

(۴) فقہ، جس کی تعلیم لاکالجوں کی تعلیم فقہ سے ذرا مختلف ہو۔ یہاں صرف اتنا کافی ہے کہ طلبہ کو اصول فقہ، تاریخ علم فقہ، مذاہبِ فقہیہ کی امتیازی خصوصیات، اور قرآن وحدیث کے نصوص سے استنباطِ احکام کے طریقے اچھی طرح سمجھا دیے جائیں۔

(۵) علم العقائد، علم کلام اور تاریخ علم کلام جسے اس طریقے سے پڑھایا جائے کہ طلبہ اس علم کی حقیقت سے واقف ہو جائیں اور متکلمین اسلام کے پورے کام پر ان کو جامع نظر حاصل ہو جائے

[1] یہ لکچر علیحدہ ایک پمفلٹ کی صورت میں مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔

(۶) تقابلِ ادیان، جس میں دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کی تعلیمات سے، ان کی امتیازی خصوصیات سے، اور ان کی تاریخ سے طلبہ کو آشنا کیا جائے۔

اس تعلیم سے جو لوگ فارغ ہوں، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ آپ ان کی ڈگری کا نام کیا رکھیں، مگر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں آئندہ انہی لوگوں کو "علمائے دین" کہا جانا چاہیے جو اس "ڈگری کو حاصل کریں، اور ان کے لیے اُن تمام اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے کھلے ہونے چاہئیں جو دوسرے مضامین کے ایم اے اور پی ایچ ڈی حضرات کو مل سکتی ہیں۔

لازمی تدابیر حضرات! یہ ہے میرے نزدیک اُس نظام تعلیم کا نقشہ جو موجودہ مذہبی تعلیم اور دنیوی تعلیم کے نظام کو ختم کر کے۔ اس ملک میں قائم ہونا چاہیے۔ مگر میں اپنے موضوعِ تقریر کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کروں گا اگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہ عرض کر دوں کہ یہ ساری گفتگو قطعی لاحاصل ہے جب تک کہ ہم اپنے پورے تعلیمی انتظامات کو بالکل ازسرِنو ڈھال کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔

سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی تعلیمی پالیسی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو اسلامی فکر رکھتے ہوں، اسلامی نظامِ تعلیم کو جانتے ہوں اور اسے قائم کرنا چاہتے بھی ہوں۔ یہ کام اگر ہو سکتا ہے تو ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہو سکتا ہے نہ کہ اُن لوگوں کے ہاتھوں جو نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اس کے نظامِ تعلیم کو، اور نہ اس کے قیام کی کوئی خواہش ہی دل میں رکھتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اگر زمامِ کار پر قابض رہیں اور ہم رات دن کی چیخ پکار سے دباؤ ڈال ڈال کر ان سے یہ کام زبردستی کراتے رہیں، تو بادلِ ناخواستہ وہ کچھ اسی طرح کی ادھوری اصلاحات کرتے رہیں گے جیسی آج کل ہو رہی ہیں، اور ان سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مدرسوں اور کالجوں کے لیے معلمین اور معلمات کے انتخاب میں انکی سیرت و اخلاق اور دینی حالت کو ان کی تعلیمی قابلیت کے برابر، بلکہ اس سے زیادہ اہمیت دیں، اور آئندہ کے لیے معلمین کی ٹریننگ میں بھی اسی مقصد کے مطابق اصلاحات کریں۔ جو شخص تعلیم کے معاملہ میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ نظامِ تعلیم میں نصاب اور اس کی کتابوں سے بڑھ کر استاد اور اس کا کیرکٹر اور کردار زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ فاسد العقیدہ اور فاسد الاخلاق استاد اپنے شاگردوں کو برگزیدہ ذہنی

اور اخلاقی تربیت نہیں دے سکتے جو ہمیں اپنے نئے نظامِ تعلیم میں مطلوب ہے۔ دوسرے تمام شعبہائے زندگی میں بگڑے ہوئے کارکن زیادہ تر موجودہ نسل ہی کو بگاڑتے ہیں، مگر نظامِ تعلیم اگر بگڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو وہ آئندہ نسل کا بھی ناس کر دیتے ہیں جس کے بعد مستقبل میں بھی کسی صلاح و فلاح کی امید باقی نہیں رہتی۔

آخری چیز اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہمیں اپنی تعلیم گاہوں کے پورے ماحول کو بدل کر اسلام کے اصول اور اسپرٹ کے مطابق بنانا ہوگا۔ یہ مخلوط تعلیم، یہ فرنگیت کے مظاہر، یہ از فرق تا بقدم مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ، یہ کالجوں کے مباحثے اور انتخابات کے طریقے، اگر آپ کے ہاں یونہی جاری رہیں، اور ان میں سے کسی چیز کو بھی آپ بدلنے کے لیے تیار نہ ہوں، تو پھر ختم کیجیے اسلامی نظامِ تعلیم کی اس ساری گفتگو کو، اور بند کیجیے اسلام اسلام کی پکار۔ اس آب و ہوا میں اسلام کا تخم ہرگز جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ اس کو برقرار رکھتے ہوئے اسلامی نظامِ تعلیم کو رائج کرنے کی کوشش اس سے زیادہ احمقانہ کوشش ہے جتنی ایک سیم زدہ زمین میں زراعت کرنے کی کوشش احمقانہ ہو سکتی ہے۔ ایک طرف آپ اسلام کے صریح احکام کی خلاف ورزی کر کے جوان لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ لا کر بٹھاتے ہیں، اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ انہی لڑکوں اور لڑکیوں میں اسلام اور اس کے احکام کا احترام پیدا ہو۔ ایک طرف آپ اپنی تمام حرکات و سکنات اور اپنے پورے ماحول سے اپنی نئی نسلوں کے ذہن پر فرنگی تہذیب و تمدن اور فرنگی طرزِ زندگی کا رعب بٹھاتے ہیں اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ زبانی باتوں سے ان کے دلوں میں اپنی قومی تہذیب کی قدر پیدا ہو جائے۔ ایک طرف آپ اپنے مباحثوں میں روز اپنے نوجوانوں کو زبان اور ضمیر کا تعلق توڑنے اور ضمیر کے خلاف بولنے کی مشق کراتے ہیں، اور دوسری طرف آپ چاہتے ہیں کہ ان کے اندر راستبازی اور حق پرستی پیدا ہو۔ ایک طرف آپ ان کو وہ سارے انتخابی ہتھکنڈے اپنے کالجوں ہی میں برتنے کا خوگر بناتے ہیں جنہوں نے ہماری پوری سیاسی زندگی کو گندا کر کے رکھ دیا ہے، اور دوسری طرف آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ یہاں سے نکل کر وہ آگے بڑے دیانتدار اور کھرے ثابت ہوں گے۔ یہ متضاد باتیں صحیح العقل لوگوں کے کرنے کی نہیں ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کو نظامِ تعلیم کی بات کرنے سے پہلے اپنے دماغ کے علاج کی فکر کرنی چاہیے۔

سُنّتِ رسولؐ

از شیخ مصطفیٰ السباعی

افسوس ہے کہ نعیم صدیقی صاحب کی علالت کے باعث ان کے مضمون کا سلسلہ اس اشاعت میں جاری نہ رہ سکا۔ تاہم اسی موضوع پر شام کے مشہور لیڈر شیخ مصطفیٰ السباعی کے ایک مفید مضمون کا ترجمہ رسالہ "المسلمون" قاہرہ سے یہاں درج کیا جا رہا ہے

ہم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر انسان امن و سعادت کا خواہش مند ہے تو اس کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ ان تعلیمات الٰہیہ کی طرف رجوع کرے جو ہر طرح کی تحریف، تغیر اور تبدیلی سے پاک ہیں اور اللہ کے آخری رسولؐ کی اس سنّت کی طرف پلٹے جو اپنی تعبیر و تفصیل کے لحاظ سے ہر ملک اور ہر زمانے کی ضروریات کے لیے کفایت کرتی ہے۔ شریعت اسلامی اور قانون اسلامی ایک بڑی وسیع اور ہمہ گیر شے ہے۔ اس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ وہ ایک مسلمان فرد، جماعت اور حکومت کے حقوق و فرائض کے درمیان بھی توازن قائم کرتی ہے اور تمام دنیا کے سامنے بھی ایک ایسی حکومتِ عادلہ کا نمونہ پیش کرتی ہے جو ہر صلح جُو کے ساتھ مصالحت اور ہر تند خُو کے مقابلے میں سختی اور شدّت سے کام لیتی ہے۔

شریعت اسلامی کے مصادر و مآخذ مسلمانوں کے ہاں مسلّم، معروف اور محفوظ ہیں۔ کتاب اللہ کے بعد شریعت کا ماخذ سنتِ مطہرہ ہی ہے۔ یہ ماخذ اپنے اندر انتہائی وسعت اور جزرسی رکھتا ہے۔ کتاب اللہ میں بیشتر عمومی و اصولی احکام و کلیات ہیں اور سنت میں جیسا کہ ہر اہل علم کو معلوم ہے، ان کلیات کی تشریحات و تفصیلات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء سلف میں سے جس نے بھی استنباطِ احکام اور تدوینِ قانون کے سلسلے میں کچھ خدمت سرانجام دی ہے اُسے ذخیرۂ سنت و حدیث سے لازماً ہدایت و رہنمائی حاصل کرنی پڑی ہے۔ مگر ابتدائی دور ہی میں مسلمانوں کے اندر بعض ایسے افراد اور جماعتوں کا ظہور

ہو گیا تھا جن کے اذہان سنت کے بارے میں شبہات کا شکار ہوئے۔ اور اسی زمانے میں یہ لوگ اہلِ سنت سے خارج قرار بھی دے دیئے گئے۔ پھر دورِ جدید میں بعض مستشرقین اور استعمار و استبداد کی راہ ہموار کرنے والے عیسائی مبلغین نے حدیث کو اعتراضات کا ہدف بنا کر مسلمانوں کے دلوں میں شکوک ڈالنے کی کوشش شروع کی۔ اور اس فتنہ پردازی سے ان کا مقصد یہ تھا کہ شریعتِ اسلامی کے اس مضبوط اور مستحکم ستون کو گرا کر وحدتِ اسلامیہ کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کا یہ جادو کام کر گیا اور خود مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے ان کے اتباع میں وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اب ضرورت ہے کہ جس طرح ابتدائی دور میں فتنۂ انکارِ حدیث کا مقابلہ کیا گیا تھا، اسی طرح اب بھی کیا جائے۔ اس لیے میرا ارادہ ہے کہ میں سنت کے موضوع پر بحث کروں، قانون اسلامی کی تدریجی اور تاریخی تدوین میں سنت کا مقام واضح کروں، علماء اسلام نے علومِ سنت و حدیث کی حفاظت و تحقیق کے سلسلے میں جو کاوشیں کی ہیں اُنہیں بیان کروں، قدیم و جدید زمانے میں حدیث پر جو حملے کیے گئے ہیں اُن پر علمی تنقید کروں اور آخر میں چند ایسے مجتہدین و محدثین کے حالات بھی مختصراً پیش کروں جنہوں نے سنت کے حفظ و بقا اور اس سے استنباطِ احکام کے سلسلے میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔

سنت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم سنت کے لفظ کے لغوی معنی طریقے اور راستے کے ہیں خواہ وہ اچھا ہو، خواہ بُرا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جس نے کوئی اچھی سنت قائم کی اُسے خود اپنے عمل کا بھی اجر ملے گا اور قیامت تک اس سنت کی پیروی کرنے والے کے عمل کا بھی۔ اور جس کسی نے کوئی بُری سنت قائم کی اُس کے اپنے فعل کی ذمہ داری بھی اُسی پر ہے اور قیامت تک جو اس بُرائی پر عمل کرے گا، اُس کی ذمہ داری میں بھی وہ شریک ہے"۔ ایک دوسری حدیث ہے کہ "تم اگلوں کی سنت کی قدم بقدم پیروی کرو گے"۔

محدثین کی اصطلاح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، تقریر، صفات اور سیرت کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہو وہ سنت ہے خواہ وہ قبلِ بعثت سے متعلق ہو یا بعدِ بعثت سے۔ بعض محدثین کے نزدیک حدیث کی تعریف بھی یہی ہے۔ علماءِ اصول کی اصطلاح میں سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کے قول، فعل اور تقریر کا نام ہے۔ قول سے مراد ایسا ارشادِ نبوی ہے جس کا تعلق تشریعِ احکام سے ہو مثلاً
"إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" یا "لا وصیۃ لوارث" (اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔ وارث کے حق میں وصیت
نہیں ہو سکتی) فعل کی مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ کام ہیں جو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور عدالتی فیصلوں
کے ضمن میں سرانجام پائے ہیں۔ تقریر سے مراد صحابہؓ کے وہ افعال ہیں جو حضورؐ کے سامنے صادر ہوئے
اور آپ نے انہیں پسند فرمایا یا سکوت اختیار فرمایا۔ اظہارِ پسندیدگی کی مثال وہ واقعہ ہے جو غزوۂ بنی
قریظہ کے بارے میں منقول ہے۔ آپ نے صحابہ کو حکم دیا تھا کہ "تم میں سے کوئی آدمی ایسا نہ ہو جو بنی قریظہ
کے پاس جا کر نمازِ عصر نہ پڑھے" بعض صحابہؓ نے اِس حکم کو لفظی معنوں میں لیا اور اگرچہ سورج رستے میں غروب
ہو گیا، لیکن انہوں نے نماز بنو قریظہ میں جا کر مغرب کے بعد پڑھی۔ دوسرے گروہ نے آپ کے ارشاد
کا مطلب صرف یہ سمجھا کہ سفر میں تیز روی سے کام لیا جائے۔ آپؐ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے کسی
فریق کے فعل کو بھی بُرا نہیں سمجھا۔ دوسری قسم کی تقریر کی مثال وہ حدیث ہے جو حضرت خالدؓ بن ولید کے
بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے گوہ کا گوشت کھایا جو آپؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا مگر آپ نے
اُسے نہیں کھایا۔ بعض صحابہؓ نے دریافت کیا "یا رسول اللہ کیا یہ گوشت حرام ہے؟" آپ نے فرمایا "نہیں،
لیکن گوہ میرے وطن میں نہیں پائی جاتی، اس لیے مجھے اس سے طبعاً کراہت ہے"۔ اصولیین کے
نزدیک ایک معنی میں سنت کا اطلاق اُس شے پر بھی ہوتا ہے جس کے حق میں کوئی شرعی دلیل موجود ہو
خواہ یہ دلیل کتاب اللہ سے ہو یا سنتِ رسول سے یا صحابہ کے اجتہاد سے۔ اس کی مثال مصحف کا جمع
کرنا اور لوگوں کو ایک ہی قرأت پر آمادہ کرنا ہے۔ اس معنی کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جس میں فرمایا گیا کہ
"علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین من بعدی"۔ سنت کے اس مفہوم کے مقابل میں "بدعت"
کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں سنت اس طریقے کو کہتے ہیں جو فرض اور واجب تو نہ
ہو مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ اس لحاظ سے یہ لفظ ایک طرف فرض اور واجب کے مقابلے میں
بولا جاتا ہے، اور دوسری طرف بدعت کے مقابلے میں۔ مثلاً طلاق کے ثابت شدہ طریقے کو طلاق السنۃ
کہا جاتا ہے اور غیر ثابت طریقے کو طلاق البدعۃ کا نام دیا جاتا ہے۔

اہلِ علم کے مذکورہ بالا گروہوں کے درمیان سنت کی اصطلاحی تعریف میں اختلاف اس وجہ سے ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے سامنے ایک الگ موضوع بحث اور مقصدِ تحقیق رکھتا ہے۔ علماء حدیث کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کا پورا اُسوہ اور نمونہ ہے۔ وہ سیرت و اخلاق، شمائل و خصائل، اقوال و افعال، اخبار و آثار ہر شئے کو نقل کر دیتے ہیں، خواہ اُن سے کوئی حکم شرعی ثابت ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ علماء اصول نے حیاتِ نبوی کا ایک شارع اور قانون ساز کی زندگی ہونے کی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے، چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن افعال، اقوال اور تقریرات پر اپنی توجہ کو مرکوز کیا ہے جن سے احکامِ شرعی کا ثبوت نکلتا ہے۔ علماء فقہ نے ان تمام افعال کو اپنے دائرہ بحث میں لیا ہے جن سے شرعی وجوب، حُرمت یا اباحت ثابت یا مستنبط ہوتی ہے۔ ہم یہاں سُنت پر اُسی حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں، جس حیثیت سے علماء اصول نے اس پر بحث کی ہے، کیونکہ اسی بحث کے دوران میں حدیث کی حجیت اور تشریعِ احکام میں اُس کا مقام واضح ہو سکتا ہے، اگرچہ اس میں شک نہیں ہے کہ ضمناً ہمیں سنّت کے اُس وسیع مفہوم سے بھی تعرض کرنا پڑے گا جو علماء محدثین کے ہاں متعین کیا گیا ہے۔

وجوبِ اطاعتِ رسول حینِ حیات | عہدِ نبوی میں قرآن مجید کے ذریعے سے جن احکام کا بتدریج نزول ہوتا تھا اُن میں سے اکثر بالکل مجمل اور مطلق ہوتے تھے، اُن کے ساتھ کوئی تفصیل و تحدید موجود نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً قرآن میں نماز کا حکم بار بار آ رہا تھا مگر اُس کی ہیئت، تعدادِ رکعات اور تفصیلِ اوقات کا ذکر احکام کے ہمراہ نہیں تھا۔ اسی طرح زکوٰۃ کا حکم نازل ہو چکا تھا مگر وہ بالکل مطلق اور غیر مقید تھا، اُس میں نصابِ زکوٰۃ، شرحِ زکوٰۃ اور دیگر شرائطِ زکوٰۃ کی تشریح موجود نہ تھی۔ اسی طرح بے شمار دوسرے قرآنی احکام تھے کہ جن کی تعمیل و تنفیذ اُس وقت تک عملاً ناممکن تھی جب تک کہ اُن کے شروط، ارکان اور مفسدات کی وضاحت موجود نہ ہوتی۔ چنانچہ اس حالت میں احکام کی تفصیلی اور واضح معرفت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف رجوع قطعی طور پر ناگزیر تھا۔ اسی طرح صحابہ کو بہت سے ایسے مسائل و معاملات سے سابقہ پیش آتا تھا جن کے بارے میں کوئی قرآنی نص موجود نہیں ہوتی تھی۔ اس صورت میں بھی حکمتِ نبوی

سے استفادہ لازمی تھا۔ کیونکہ حدود و مقاصدِ شریعت کو جاننے والا، رسولؐ سے بڑھ کر کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ قرآن میں ہی اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ نبی کا تعلق قرآن سے یہ ہے کہ وہ قرآن کی وضاحت اور تبیین کرتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل۔ ۴۴)

ہم نے تیری طرف الذکر نازل کیا ہے تاکہ تو لوگوں کے لیے اس چیز کو واضح کرے جو ان کی طرف اتاری گئی ہے

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (النحل۔ ۶۴)

ہم نے تجھ پر کتاب اس لیے اتاری ہے کہ تو اُن کے لیے اُس چیز کی وضاحت کر دے جس میں انہوں نے باہم اختلاف کیا ہے۔

اسی طرح ہر متنازع فیہ معاملے میں قرآن نے مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ نبی کی ذات کو حَکَم بنائیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء۔ ۶۵)

پس ہرگز نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز ایمان نہیں لا سکتے جب تک کہ تجھے باہمی جھگڑوں میں حَکَم نہ بنائیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلے پر تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پورے طور پر سپر نہ ڈال دیں۔

اللہ نے اپنی کتاب میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ رسول کو صرف قرآن ہی نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ حکمت بھی عطا کی گئی ہے تاکہ وہ لوگوں کو اس کی تعلیم دے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران ۱۶۴)

یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا جبکہ اُس نے ان میں ایک رسول بھیجا جو اُن پر اُس کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے درآنحالیکہ پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

جمہور علماء محققین کے خیال کے مطابق حکمت قرآن کے علاوہ ایک مستقل شے ہے اور اس سے مراد قرآن کے منشا اور دین کے نظام اور شریعت کے مقاصد کا وہ فہم ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو نوازا تھا۔ یہی فہم جب آپ کے قول و فعل میں ظاہر ہوا تو سنت کہلایا۔ امام شافعی فرماتے ہیں "اللہ نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے اُس سے مراد قرآن ہے اور جس حکمت کا ذکر کیا ہے اُس کے بارے میں مَیں نے اپنے دیار کے اہل علم سے یہی سنا ہے کہ وہ سنت ہے۔ حکمت کا ذکر جگہ جگہ کتاب کے ذکر کے بعد آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنے اس احسان کو بیان فرمایا ہے کہ انہیں رسول کے ذریعے سے کتاب و حکمت سکھائی جا رہی ہے۔ یہاں حکمت سے سنتِ رسول کے علاوہ کچھ اور مراد لینا ممکن نہیں ہے، کیونکہ قرآن میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ صرف رسول کی اطاعت ہی فرض کی گئی ہے اور اسی طرح ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول کو بھی لازمی قرار دیا گیا ہے" پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جس چیز کا ذکر بطور احسان کے فرمایا گیا ہو اور جسے واجب الاتباع قرار دیا گیا ہو وہ سوائے حق و صواب کے کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ تشریع احکام کے سلسلے میں مقامِ رسالت کو مندرجہ ذیل آیت بھی واضح کرتی ہے:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔	وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو اُن کے لیے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام کرتا ہے اور اُن پر سے وہ بوجھ اور بیڑیاں اُتارتا ہے جو ان پر تھیں۔

اس آیت کے الفاظ بالکل عام ہیں اور ان سے مراد حلت و حرمت کے وہ احکام بھی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں اور وہ احکام بھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ متعدد مقامات پر قرآن میں آنحضور کو مصدر احکام قرار دیا گیا ہے، اور آپ کے امر و نہی کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۔ (الحشر۔ ۷)	رسول جو کچھ (حکم) تمہیں دے اُسے تھام لو اور جس سے تمہیں روکے، رک جاؤ۔
وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ	اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، توقع ہے کہ تم پر

تُرْحَمُوْنَ۔ (آلِ عمران۔۱۳۲) رحم کیا جائے گا۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ۔ (الانفال۔۲۴)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو لبیک کہو اللہ اور رسول کی پکار پر جب وہ تمہیں اُس چیز کے لیے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔

بلکہ اطاعتِ رسول کو اطاعت اللہ کا ہم معنی اور مترادف قرار دیا گیا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء۔۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی، اُس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ (آلِ عمران۔۳۱)

کہدو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا۔

اسی طرح رسول کی عدمِ اطاعت اور مخالفتِ امر پہ عذاب الیم کی دھمکی دی گئی ہے اور اسے کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (النور۔۶۳)

پس ڈرنا چاہیے اُن لوگوں کو جو اُس رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، کہیں وہ فتنے یا عذاب الیم میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ (آلِ عمران)

کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو اللہ ایسے کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب۔۳۶)

کسی مومن مرد اور عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو اُن کے لیے کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے پس وہ کھلی موئی

گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ۔

(النور - ۴۷)

اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی پھر اُن میں سے ایک گروہ اس کے بعد منہ پھیرتا ہے اور یہ لوگ مومن نہیں ہیں اور جب وہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ (رسول) اُن کے مابین فیصلہ کرے، تو اُس وقت اُن میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔

(النور - ۵۱)

مومنوں کا کہنا تو صرف یہ ہوتا ہے جب وہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ (رسول) اُن کے درمیان فیصلہ کرے، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

صرف اطاعت و عدم اطاعت کو مدار ایمان و کفر نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اس امر کو بھی لوازم ایمان میں سے قرار دیا گیا کہ اگر مومنین کسی اجتماعی کام میں رسول کے ساتھ شریک ہوں، تو بلا اجازت وہاں سے رخصت نہ ہوں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ

(النور - ۶۲)

مومن تو وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے اور جب وہ اس کے ساتھ کسی اجتماعی کام میں ہوتے ہیں تو اُس وقت تک نہیں جاتے، جب تک اُس سے اجازت نہ حاصل کریں۔

ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں فرمایا ہے کہ "جب رسول کے پاس سے جانے کے لیے استیذان کو لازمۂ ایمان قرار دیا گیا ہے تو پھر زندگی کے دوسرے اقوال و افعال میں تو بدرجۂ اولیٰ استیذان ایک مومن کے لیے ضروری اور ناگزیر ہو گیا۔ آج یہ استیذان اُس سنت سے ہو گا جو ہمارے پاس موجود ہے۔"

انہی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ صحابہؓ احکامِ قرآنیہ کی تفسیر، مشکلات کے حل، اور متنازع فیہ مسائل کے فیصلے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے، آپ کے اوامر و نواہی کی پابندی کا التزام کرتے تھے، اور عبادات و معاملات میں آپ کی سنت کا اتباع کرتے تھے، الّا یہ کہ انہیں اس کا علم ہو جاتا کہ کوئی فعل آپؐ کے لیے خاص ہے۔ حضورؐ خود بھی اسی کا حکم دیا کرتے تھے، چنانچہ فرمایا "صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ۔ البخاری (نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھتے ہو)۔ خذوا عنی مناسککم۔ المسلم (مجھ سے مناسک حج سیکھو)۔ اگر صحابہ میں سے کسی کے بارے میں آپ کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپ کی سنت کا اتباع نہیں کرتے تو آپ ناخوش ہوتے تھے۔ چنانچہ موطا امام مالک میں عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ ایک صحابی نے اپنی بیوی کو حضورؐ کے گھر اس لیے بھیجا کہ وہ روزے کی حالت میں بوسہ لینے کا مسئلہ دریافت کرے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں ازواج کا بوسے لیتے ہیں۔ جب صحابی کی اہلیہ نے خاوند کو اس کی خبر دی تو انہوں نے کہا "میں رسول اللہ کے مانند نہیں ہوں، اللہ اپنے رسول کے لیے جس چیز کو چاہے حلال کر سکتا ہے"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچی تو آپ نے غضب ناک ہو کر فرمایا "میں تم میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں اور سب سے زیادہ حدود اللہ کو جاننے والا ہوں"۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے صحابہ کو سر منڈانے اور احرام کھول دینے کا حکم دیا، مگر انہوں نے اس میں تامّل کیا۔ آپ پر یہ چیز بہت شاق گزری اور آپ نے خود حلق و احلال کو سرانجام دیا۔ تب صحابہ نے بھی فوراً اس کا اتباع کیا۔ بعد میں صحابہ کا جذبۂ اتباع اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ آپ جو کچھ کرتے تھے، صحابہ وہی کچھ کرتے تھے اور آپ جس چیز سے رک جاتے تھے صحابہ بھی اُسے ترک کر دیتے تھے، بغیر اس کے کہ اس اخذ و ترک کی علت و حکمت انہیں معلوم ہوتی یا وہ اس کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ سونے کی ایک انگوٹھی کو اتار کر پھینک دیا تھا اور آپ نے فرمایا تھا کہ میں اسے کبھی نہیں پہنوں گا۔ صحابہ میں جن جن کے پاس ایسی انگوٹھیاں تھیں انہوں نے بھی انہیں اتار کر پھینک دیا۔ اسی طرح شرح الشفا للقاضی میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضورؐ نے نماز

کے دوران میں اپنے جوتے اتار کر بائیں طرف رکھ دیے۔ صحابہ جو مقتدی تھے ان سب نے بھی ایسا ہی کیا۔ جب نماز ختم ہوئی تو آپ نے پوچھا کہ تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کو دیکھ کر ایسا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جبریل نے مجھے خبر دی تھی کہ میرے جوتوں میں کچھ نجاست لگی ہے۔ طبقات ابن سعد میں مروی ہے کہ آپ نے نماز ظہر کی دو رکعتیں قبلۂ اول بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی تھیں کہ اسی اثنا میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہو گیا اور آپ نے مسجد حرام کی طرف رُخ پھیر لیا اور ساتھ ہی صحابہؓ نے بھی فوراً ادھر منہ پھیر لیا۔ امتثالِ امر کی یہ کیفیت اِس درجہ صحابہ میں موجود تھی کہ بظاہر نہایت معمولی اور غیر اہم امور میں بھی صحابہ فوراً تعمیل کرتے تھے۔ ابو داؤد اور ابن عبد البر نے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ایک مرتبہ جمعہ کے لیے مسجد میں آئے تو آنحضورؐ خطبہ دے رہے تھے۔ یکایک ان کے کان میں حضور کی آواز آئی کہ "بیٹھ جاؤ" حضرت ابن مسعودؓ اس وقت مسجد کے دروازے میں تھے۔ سُنتے ہی وہیں بیٹھ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آپ کو بیٹھے دیکھا تو فرمایا "اے ابن مسعود آگے آجاؤ"۔

اِن چند مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ صحابہ نبیؐ کے قول، فعل اور تقریر کو حکم شرعی سمجھتے تھے۔ اس امر پر اجماع تھا اور کسی ایک کو بھی اِس بارے میں اختلاف نہ تھا جس طرح وہ احکام قرآنی کی خلاف ورزی کو اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے تھے، ٹھیک اسی طرح وہ سنتِ نبوی کی خلاف ورزی کو بھی ناجائز خیال کرتے تھے۔ صحابہ اگر کسی معاملے میں اختلاف رائے کا اظہار کرنا بھی چاہتے تھے تو پہلے دریافت کر لیتے تھے کہ اِس معاملے میں وحی کی رہنمائی حاصل ہو چکی ہے یا نہیں؟ مثلاً جیسا کہ حضرت حباب بن منذرؓ نے غزوۂ بدر کی مورچہ بندی کے لیے انتخابِ مقام کے موقع پر دریافت کیا تھا۔ بعض اوقات حکمتِ احکام کی معرفت کی خاطر صحابہ سوالات کرتے تھے، لیکن سنتِ رسول کے سامنے اُن کا دائمی رویہ مطلق تسلیم، کامل اتباع اور کلی التزام کا ہی ہوتا تھا۔

وجوبِ اطاعت بعد وفات اوامرِ قرآنی کے بموجب جس طرح اتباع و اطاعتِ رسول آپ کی زندگی میں واجب تھی، بالکل اُسی طرح سنت کا اتباع مسلمانوں کے لیے آپ کی وفات کے بعد بھی لازم ہے۔ کیونکہ نصوصِ قرآنی نے جس چیز کو واجب ٹھہرایا ہے وہ عام اطاعت ہے، ان میں یہ قید نہیں ہے کہ

اسوۂ نبیؐ صرف نبیؐ کی زندگی تک مستحق اطاعت ہے، اور نہ یہ کہ اطاعت کا حکم صحابہ کے لیے خاص ہے۔ اطاعت کی علت جیسی اُس وقت موجود تھی، بالکل ویسی ہی آج بھی موجود ہے۔ آپؐ کی حیات میں ہی یہ اصول طے ہو چکا تھا کہ آپ کی سنت کی پیروی صرف آپ کے سامنے نہیں بلکہ آپ کی غیبت میں بھی لازم ہے۔ اصحابِ سنن، ابنِ سعد اور ابن عبدالبر نے روایت کیا ہے کہ جب آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تھا تو اُن سے پوچھا تھا کہ اگر کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا کہ کتاب اللہ کے مطابق۔ پوچھا اگر کتاب اللہ میں اس کا ذکر نہ ہو تو؟ انہوں نے عرض کیا کہ پھر میں سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پوچھا اگر سنت رسول میں بھی مذکور نہ ہو تو؟ انہوں نے عرض کیا کہ پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ آنحضورؐ نے دستِ مبارک سے اُن کا سینہ ٹھونکا اور فرمایا شکر اور تعریف ہے اُس اللہ کے لیے جس نے رسول اللہ کے فرستادہ کی رائے کو رسول اللہ کی مرضی کے موافق کر دیا۔ اسی طرح آپؐ نے ہی مسلمانوں کو حیاتِ طیبہ کے بعد سنت پر عمل کرنے کے لیے ابھارا ہے اور اس کی تاکید فرمائی ہے۔ اس ضمن میں بکثرت احادیث مروی ہیں جو حدِ تواتر کو پہنچتی ہیں۔ مثلاً حاکم اور ابن عبدالبر نے عبداللہ بن عمرو بن عوف سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، جب تک تم انہیں تھامے رہو گے، گمراہ نہ ہو گے — کتاب اللہ اور میری سنت۔ یہی روایت بیہقی نے بھی حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابن عباس کے واسطے سے یہ فرمانِ نبوی نقل کیا ہے کہ "جب تمہارے سامنے کتاب اللہ سے کچھ رکھا جائے تو وہ واجب التعمیل ہے، اُس کے ترک میں کسی کے لیے عُذر جائز نہیں۔ اگر کوئی چیز کتاب اللہ سے نہ ہو لیکن نبی کی سنتِ ماضیہ سے ہو۔ تو وہ بھی ویسی ہی واجب التعمیل ہے۔" اب ظاہر ہے کہ آپ کی سنت، سنتِ ماضیہ کا درجہ انہی لوگوں کے لیے اختیار کرتی ہے جو آپ کی حیات کے بعد اسلام کے رستے پر چلنے والے ہوں۔ امام بخاری و حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میری امت کا ہر شخص جنت میں داخل ہو گا، سوائے اس شخص کے جو انکار کر دے۔" صحابہ نے عرض کیا یا رسول انکار کون کرے گا؟ آپ نے فرمایا "جس نے میری اطاعت کی

وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کر دیا" حاکم نے حضرت ابن عباس کے حوالے سے خطبہ حجۃ الوداع کا یہ فقرہ نقل کیا ہے" میں تمہارے اندر وہ کچھ چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوط پکڑا تو تم کبھی گمراہ نہ ہوگے ۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت"۔ ابن عبدالبر، ترمذی، ابوداؤد، احمد اور ابن ماجہ نے عرباضؓ بن ساریہ سے آنحضورؐ کی ایک تقریر نقل کی ہے جو آپؐ نے ایک روز نماز صبح کے بعد فرمائی۔ اس میں آپؐ نے فرمایا" جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا پس تم میری سنت اور میرے راست رو ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت پر جمے رہنا، اسے دانتوں سے پکڑے رہنا اور خبردار محدثات اور بدعات سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم نے نہ صرف خود سنت سے غایت درجہ اعتناء کیا بلکہ اسے امانت رسول کے طور پر اپنے بعد کی نسلوں کی طرف بھی منتقل کیا۔ اس تبلیغ علم کی رغبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے اس ارشاد کے ذریعے سے دلائی تھی کہ" اللہ اس آدمی کو آسودہ رکھے جس نے میری بات کو سنا اور پھر اسے جیسے سنا تھا، آگے پہنچا دیا۔ بسا اوقات سننے والے سے بڑھ کر محافظ و خداشناس وہ شخص ہوتا ہے جس تک سننے والا پہنچاتا ہے"۔

صحابہ سنتِ رسول کو کیسے اخذ کرتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے درمیان اس طرح زندگی گزارتے تھے کہ فریقین کے درمیان کسی طرح کا حجاب حائل نہیں ہوتا تھا۔ نبیؐ اور صحابہ مسجد میں، بازار میں، گھر میں، سفر میں، حضر میں ہر جگہ ملتے جلتے تھے۔ آپؐ کے افعال و اقوال صحابہ کی کمال درجے کی توجہ کا مرکز بنے رہتے تھے اور آپ کی پوری شخصیت صحابہ کی دینی و دنیوی زندگی کا محور تھی، کیونکہ آپ ہی کے ذریعے سے انہیں اللہ نے ہدایت بخشی تھی۔ اور ضلالت کی تاریکیوں سے نکال کر نور ایمان کی طرف رہبری کی تھی۔ آپؐ کے احوال کے تتبع کی حرص اور خواہش صحابہ میں اس حد تک موجود تھی کہ اگر ان میں سے ہر شخص ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر نہیں رہ سکتا تھا تو وہ باہمی طور پر باری باری حاضری کا انتظام طے کر لیتے تھے تاکہ اسوہ نبوی میں سے کسی شئے سے وہ بے خبر نہ رہ جائیں۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عمرؓ بن الخطاب کی روایت موجود ہے کہ میں اور میرا ایک انصاری ہمسایہ مضافات مدینہ میں رہتے تھے اور

ہم دونوں باری باری سے رسول اللہ کے پاس حاضری دیتے تھے۔ جس روز میں حاضر ہوتا تھا اُس روز کی سرگذشت میں اسے سناتا تھا اور جب اس کی باری ہوتی تھی تو وہ بھی ایسا ہی کرتا تھا۔ یہ صورت حال اِس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ صحابہ سیرتِ نبوی کی کامل پیروی کا نظریہ اور داعیہ اپنے اندر رکھتے تھے اور آپ کے اوامر و نواہی اُن کے نزدیک واجب الاتباع تھے۔ اسی طرح مدینہ سے باہر کے قبائل اپنے افراد اور وفود کو آپؐ کے پاس بھیجتے تھے تاکہ وہ احکامِ دین جاکر سیکھیں اور پھر آکر اپنے قبیلوں کو سکھائیں۔ بعض بدوی صحابی احکامِ شرعی معلوم کرنے کے لیے دور دراز کا سفر طے کرکے آتے تھے اور چند باتیں معلوم کرکے لوٹ جاتے تھے اور اِس آمد و رفت میں کسی دوسری غرض کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ بخاری میں عقبہؓ بن حارث سے روایت ہے کہ ایک عورت نے بیان کیا کہ اُس نے عقبہؓ اور اُن کی اہلیہ دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ چنانچہ عقبہ مکہ سے فوراً مدینے روانہ ہوگئے اور سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کیف وقد قیل۔ اب نکاح کیسے باقی رہ سکتا ہے، جبکہ ایسی بات کہہ دی گئی ؟ حضرت عقبہؓ نے اُسی وقت بیوی کو طلاق دیدی اور اُس نے دوسرا نکاح کرلیا۔ صحابہؓ صرف آنحضورؐ سے ہی مسائل نہیں سیکھتے تھے بلکہ ان کا قاعدہ یہ بھی تھا کہ وہ ازواجِ مطہراتؓ کے پاس بھی اس غرض کے لیے جاتے تھے۔ چنانچہ تقبیل صائم کے سلسلے کا ایک واقعہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ اِسی طرح صحابیاتؓ بھی آپ کے گھروں میں جاتی تھیں۔ کبھی تو وہ براہِ راست آپ سے سوالات کرتی تھیں اور کبھی ازواجِ مطہراتؓ کی وساطت سے پوچھواتی تھیں۔ آپ بھی کبھی براہِ راست جواب دیتے تھے اور اگر کبھی ایسا کرنا نامناسب ہوتا تھا تو آپ ازواج سے فرماتے تھے اور وہ آگے سمجھا دیتی تھیں چنانچہ بخاری و مسلم میں یہ روایت موجود ہے کہ ایک عورت نے آکر پوچھا کہ میں حیض سے طہارت کیسے حاصل کروں۔ آپ نے فرمایا کہ کسی ٹکڑے سے وضو کرلے (وضو کے لغوی معنی دھونے اور پاکیزگی حاصل کرنے کے ہیں)۔ عورت نے اپنا سوال کئی مرتبہ دہرایا اور آپ نے ہر مرتبہ وہی جواب دیا مگر وہ نہ سمجھی۔ آخر آپؐ نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ اُسے سمجھا دیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ نے اُسے سمجھایا کہ وہ صاف روئی کا ایک ٹکڑا لے کر اُسے خون والی جگہ پر رکھے،

جب وہ ٹکڑا بالکل صاف رہے، تو یہ طہارت کی علامت ہے۔

یہ امر بلاشبہ قابلِ ذکر ہے کہ جملہ صحابہ کا علم و فہم مساوی نہیں تھا۔ بعض اُن میں سے شہری تھے، بعض بدوی۔ بعض ان میں تاجر و صانع تھے اور بعض اصحاب صفہ اور دنیوی مشاغل سے بالکل علیحدہ۔ بعض کا قیام بشتر مدینے میں رہتا تھا اور اکثر وہاں سے غائب رہتے تھے۔ پھر ایسا بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ آپؐ وعظ و ارشاد کے ہر موقع پر تمام صحابہ کو جمع کرنے کا اہتمام فرماتے۔ ایسا تو ایامِ جمعہ و عیدین، اور دیگر شاذ مواقع پر ہی ہوتا تھا۔ بخاری میں حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم موعظت و تلقین کئی کئی ایام کے وقفوں کے ساتھ کرتے تھے تاکہ لوگ اُکتا نہ جائیں۔ اسی طرح مسروق تابعی کا قول مشہور ہے کہ مَیں نے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی کے مختلف حوضوں کی مانند پایا ہے۔ بعض اُن میں سے ایک آدمی کی پیاس بجھاتے ہیں، بعض دو کی، بعض دس کی، بعض سو کی اور بعض ایسے بھی ہیں کہ اُن سے روئے زمین کے تمام انسان و حیوان سیراب ہو سکتے ہیں۔ اِس بارے میں ایک قدرتی اصول یہ ہے کہ صحابہ میں سے سنت رسول کو سب سے زیادہ جاننے والے وہ تھے جو سابق الاسلام تھے۔ مثلاً خلفاء اربعہ اور عبداللہ ابن مسعود وغیرہم۔ یا پھر وہ لوگ تھے جنہیں آنحضورؐ کا شرف مصاحبت و ملازمت زیادہ حاصل رہا ہے، مثلاً حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرو بن عاص وغیرہم۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

عہدِ نبوی میں احادیث کیوں مرتب نہیں کی گئیں؟

مؤلفینِ سیرت، علماء حدیث اور جمہور مسلمین کے مابین اِس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رسولؐ اور صحابہ کی اولین توجہ حفاظت قرآن کی طرف مبذول تھی۔ چنانچہ آپؐ کے وصال کے وقت قرآن سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہو چکا تھا۔ صرف اُسے ایک مصحف کی شکل دینے کی کسر باقی تھی۔ حدیث و سنت کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ اگرچہ اُس کے مصدرِ تشریع ہونے کی حیثیت مسلّم تھی لیکن اُس کی تدوین اس طریقے سے نہیں کی گئی جس طرح قرآن کی ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حدیث کا مواد قرآن کی طرح مختصر نہیں تھا۔ اقوال، اعمال اور معاملات کا یہ عظیم الشان ذخیرہ ایک نبی کی جامع اور ہمہ گیر تیئیس سالہ حیات سے تعلق رکھتا تھا جس کے دیکھنے،

سننے، اور جاننے والے ہزارہا افراد تھے، اور بیک وقت سب کو ہی اس سے واسطہ نہ پیش آتا تھا بلکہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کو پیش آتا تھا۔ اُس زمانے میں پڑھے لکھے صحابہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ سامانِ کتابت کا یہ حال تھا کہ قرآن کی کتابت کے لیے بھی کچھ کھجور کے پتے، جھلیاں اور پتھر کی تختیاں بمشکل فراہم کرتے تھے۔ اس زمانے کے فنِ تحریر کو بھی آج کل کی زود نویسی سے کوئی نسبت نہ تھی۔ ان حالات میں کیسے ممکن تھا کہ ہر صحابی اپنے ساتھ ایک نوٹ بک اور پنسل رکھتا اور جو کچھ دیکھتا یا سنتا اسے لکھتا جاتا؛ اُن میں سے جو لکھے پڑھے تھے ان کے لیے بھی یہ عملاً دشوار بلکہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن کی طرح صاحبِ قرآن کی تمام حرکات و سکنات کو بھی لکھ لیتے اور ایک منضبط تحریری شکل میں اُسے بعد کی نسلوں کے سپرد کرتے۔ پھر عرب چونکہ ایک امّی اور اَن پڑھ قوم تھے اس لیے اپنے معاملات میں اُن کا واحد اعتماد اپنے حافظے اور استحضار پر ہوتا تھا۔ مزید برآں کتابتِ قرآن کے ابتدائی دَور میں کتابتِ حدیث سے ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ قرآن و حدیث خلط ملط نہ ہو جائیں۔ اس وجہ سے بھی حدیث کا لکھنا صحیح نہ خیال کیا گیا۔ عدمِ تدوینِ سنت کے اور بھی بہت سے وجوہ ہیں جو علماء نے تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری سے جو قولِ رسولؐ مروی ہے کہ "قرآن کے سوا کسی چیز کو میری طرف سے نہ لکھو اور جس نے لکھی ہو وہ مٹا دے" وہ اِسی صورتِ حال سے تعلق رکھتی ہے۔

کیا عہدِ نبوی میں احادیث لکھی ہی نہ گئی تھیں؟ لیکن عہدِ نبوی میں اگر قرآن کی طرح حدیث کی باضابطہ تدوین نہیں ہوئی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس عہدِ مبارک میں کوئی حدیث سرے سے لکھی ہی نہیں گئی۔ متعدد احادیثِ صحیحہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اِس عہد میں بھی کتابتِ حدیث ہوتی رہی ہے۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ فتح مکہ کے سال آپ نے حَرَم کی حُرمت کو واضح کرنے کے لیے سوار ہو کر ایک تقریر فرمائی تھی۔ تقریر کے خاتمے پر اہلِ یمن میں سے ایک صاحب ابوشاہ نامی نے عرض کیا "یا رسول اللہ میرے لیے یہ خطبہ لکھوا دیجئے"۔ آپ نے فرمایا "اکتبوا لابی شاہؓ" ابوشاہ کو لکھ کر دے دو۔ اسی طرح آپ نے ہم عصر ملوک کے نام خطوط لکھوائے اور آپ اپنے عُمّال اور سپہ سالاروں کو بھی ہدایات تحریر کراتے تھے۔ بعض لکھے پڑھے صحابہ کے پاس صحیفے اور یادداشتیں

بھی ہوتی تھیں جن میں وہ ارشاداتِ نبوی کو لکھ لیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے پاس ایسی ایک نوٹ بک تھی جسے وہ "صادقہ" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ امام احمد و بیہقی نے حضرت ابوہریرہ کا قول نقل کیا ہے کہ عبداللہ ابن عمرو کے سوا مجھ سے بڑھ کر کوئی عالم حدیث نہ تھا۔ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔ بعض صحابہ کی نگاہ میں حضرت عبداللہ کا فعل کھٹکا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ آپ رسول اللہ کی ہر بات لکھ لیتے ہیں حالانکہ حضور بعض اوقات ناراضگی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس پر حضرت ابن عمرو نے آپؐ سے رجوع کیا۔ آپؐ نے فرمایا "تم مجھ سے سن کر لکھ لیا کرو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میرے منہ سے سوائے حق کے اور کچھ نہیں نکلتا"۔ حضرت علیؓ سے بھی ثابت ہے کہ ان کی ایک یادداشت میں دیتِ عاقلہ اور بعض دیگر احکام تحریر تھے۔ اسی طرح اس کا ثبوت موجود ہے کہ حضورؐ نے اپنے گورنروں کو فرامین ارسال فرمائے تھے جن میں مواشی اور دیگر اموالِ زکوٰۃ کے نصاب اور شرحِ زکوٰۃ کی تفصیل درج تھی۔

کتابتِ حدیث کے بارے میں اجازت اور ممانعت پر دلالت کرنے والی جو دو طرح کی احادیث وارد ہیں، ان کے متعلق اکثر اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ نہی پہلے تھی اور بعد میں اجازت دے دی گئی۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ نہی کی اصل غرض قرآن و سنت کو گڈمڈ ہونے سے بچانا تھا، اس لیے جہاں اس امر کا خطرہ موجود نہ تھا وہاں آنحضورؐ نے کتابتِ حدیث کی اجازت دے دی اور جہاں خطرے کا امکان تھا وہاں روک دیا۔ ہماری تحقیق اس بارے میں یہ ہے کہ جس چیز سے منع فرمایا گیا تھا وہ قرآن کی طرح حدیث کی باقاعدہ و باضابطہ تدوین تھی۔ باقی ذاتی یادداشتوں کی ممانعت نہیں کی گئی تھی۔

(باقی)

چند احادیث پر اعتراض اور اُن کا جواب

سوال: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس احادیث کے لیے میرے دل میں احترام کا جذبہ کسی کٹر سے کٹر اہل حدیث سے کم نہیں۔ اسی لیے ہر وقت دعا مانگتا ہوں کہ خدا مجھے منکرین حدیث کے فتنے سے بچائے۔ لیکن چند احادیث کے متعلق ہمیشہ میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ امید ہے کہ آنجناب ازراہِ کرم ان احادیث اور ان سے متعلق میرے شبہات کو ملاحظہ فرمائیں گے اور ان کی وضاحت کر کے میری پریشانی و بے اطمینانی رفع فرما دیں گے۔ شکر گذار ہونگا۔

اخلاقی لحاظ سے معیوب

(۱) حضرت عائشہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے متعلق استفسار کیا گیا تو انہوں نے برتن منگوا کر اور پردہ لٹکا کر اپنے بھائی اور ایک غیر شخص کی موجودگی میں غسل فرمایا (بخاری، جلد اول ص۳۹)

(۲) حضرت سبرہ کی روایت نکاح متعہ کے متعلق کہ ہم دو ساتھی بنی عامر کی کسی عورت کے پاس گئے اور اسے اپنی خدمات پیش کیں۔ (مسلم جلد سوم، ص۲۲۳)

(۳) حضرت جابر کی روایت کہ ہم نبی صلعم اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں مٹھی بھر آٹا دے کر عورتوں کو استعمال کر لیتے تھے اور اس حرکت سے ہمیں حضرت عمرؓ نے روکا۔ (مسلم، جلد سوم ص۲۲۴)

(۴) حضرت جابر فرماتے ہیں کہ ہم نے ذی الحجہ کی پانچویں تاریخ کو احرام توڑ کر خوب جماع کیا اور پانچویں دن کے بعد جب ہم عرفہ کے لیے روانہ ہوئے تو تقطر مذاکیرنا المنی (مسلم۔ جلد سوم، ص۲۷۳)

خلاف علم و عقل

(۵) حضرت ابوذرؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آفتاب کے متعلق بتایا کہ ڈوبنے کے بعد آفتاب عرش کے نیچے سجدے میں گر جاتا ہے اور صبح تک دوبارہ طلوع ہونے کی اجازت

مانگتا رہتا ہے۔ (بخاری، جلد دوم، صہ ۳۷)

(۶) حضرت ابوہریرہ کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ جہنم نے خدا سے دم گھٹنے کی شکایت کی، اور سانس لینے کی اجازت مانگی۔ اللہ نے فرمایا تو سال میں دو سانس لے سکتی ہے۔ چنانچہ انہی سے دونوں موسم (گرما و سرما) پیدا ہوئے۔ (بخاری، جلد دوم، صہ ۱۴۳)

(۷) مرد کا نطفہ سفید ہوتا ہے اور عورت کا زرد۔ انزال کے بعد یہ دونوں قسم کے نطفے مل جاتے ہیں۔ اگر یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو تو بچہ پیدا ہوتا ہے ورنہ بچی۔ (مسلم جلد اول، صہ ۱۴۸)

(۸) مجامعت کے وقت اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے ورنہ ماں پر۔ (بخاری، جلد دوم، صہ ۱۴۹)

توہینِ انبیاء

(۹) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ختنہ اسی برس کی عمر میں ہوا تھا۔ (بخاری، جلد دوم، صہ ۱۵۵)

(۱۰) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق نبی صلعم نے فرمایا کہ ایک دن حضرت سلیمان نے ارشاد فرمایا کہ آج رات میں اپنی تمام بیویوں سے، جن کی تعداد ایک سو ایک یا ننانوے تھی، مجامعت کروں گا۔ ہر ایک بیوی سے ایک شہسوار پیدا ہوگا جو خدا کی راہ میں جہاد کرے گا۔ کسی نے کہا انشاء اللہ بھی ساتھ کہیے۔ لیکن حضرت سلیمان نے پروا نہ کی۔ چنانچہ وہ تمام بیویوں کے پاس گئے لیکن ایک کے سوا کوئی حاملہ نہ ہوئی (بخاری، جلد دوم، صہ ۹۳)

(۱۱) حضرت حُذیفہ کی روایت ہے کہ نبی صلعم کھاد کے ایک ڈھیر کے قریب گئے اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ (بخاری، جلد اول، صہ ۳۶)

(۱۲) بخاری میں حضرت ابراہیم علیہ السلام (جنہیں قرآن نے صدیق نبی کا خطاب دیا ہے) کے تین جھوٹ کا ذکر ہے اور یہ تین جھوٹ بھی اس شدید نوعیت کے کہ ان کی وجہ سے وہ قیامت کے دن شفاعت کرنے سے شرمندہ ہونگے (مسلم، جلد اول، صہ ۳۷۲)۔ ان میں سے

دو واقعات کا ذکر تو قرآن نے بھی کیا ہے۔ لیکن تیسرا واقعہ یعنی حضرت ابراہیمؑ کا ایک زانی بادشاہ کے خوف سے اپنی بیوی کو بہن ظاہر کرنا تو قرآن میں کہیں مذکور نہیں۔

خلافِ انصاف

(۱۳) ام شریک کی روایت (بخاری، جلد دوم، صفحہ ۱۵۳) کے مطابق نبی صلعم نے چھپکلی کو مارنے کا حکم دیا تھا کیونکہ یہ اُس آگ کو پھونکوں سے بھڑکاتی تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو پھینکا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایک چھپکلی کی پھونکوں میں آگ بھڑکانے کی طاقت کہاں سے آگئی؟ اور پھر ایک چھپکلی کے جرم کے بدلے چھپکلیوں کی ساری نسل کو سزا دینا کہاں کا انصاف ہے؟

(۱۴) ایک روایت کے مطابق عورت، گدھا، اور کتا سامنے سے گزر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ (مسلم، جلد دوم، صفحہ ۱۱۱)

متفرق

(۱۵) اگر مکھی کسی پینے کی چیز میں گر جائے تو اسے غوطہ دے کر نکالو، کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں شفا۔ (بخاری، جلد دوم، صفحہ ۱۴۸)

مندرجہ بالا احادیث میں سے اکثر بخاری شریف سے لی گئی ہیں جو ہمارے عقیدے کے مطابق اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ براہِ کرم اسکی بھی وضاحت کر دیجیے کہ اصح الکتب کا مطلب آیا یہ ہے کہ بخاری بھی قرآن کی طرح حرفاً حرفاً صحیح اور غیر محرّف ہے؟

جواب: آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ شکایت عرض ہے کہ آپ نے تمام احادیث کے حوالے بخاری و مسلم کی جلدوں اور صفحات کے نمبروں کی صورت میں دیے ہیں؛ حالانکہ اِن کتابوں کو دنیا کے بیسیوں مطابع نے مختلف سائزوں پر بارہا طبع کیا ہے، اور ضروری نہیں ہے کہ ان کا جو ایڈیشن آپ کے پاس ہو وہی دوسرے کے پاس بھی ہو۔ ایسی کتابوں کا حوالہ ہمیشہ ان کی "کتاب" اور "باب" کے عنوان سے دینا چاہیے تاکہ آدمی آسانی سے مطلوبہ حدیث تلاش کر سکے۔

آپ کے سوالات دیکھنے سے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً آپ نے خود ان کتابوں کا بالاستیعاب

مطالعہ نہیں فرمایا ہے بلکہ منکرینِ حدیث نے فتنہ پردازی کی غرض سے "قابلِ اعتراض" حدیثوں کی جو فہرستیں مرتب کر کرکے شائع کی ہیں، انہی میں سے کوئی فہرست آپ کی نگاہ سے گذری ہے، اور آپ نے زیادہ سے زیادہ بس اتنی تحقیق کی زحمت اٹھائی ہے کہ اس فہرست کی حدیثوں کو بخاری و مسلم کے کسی نسخے میں نکال کر یہ اطمینان کر لیا ہے کہ یہ حدیثیں وہاں موجود ہیں۔ میرے اس شبہ کی بنیاد یہ ہے کہ آپ کی پیش کردہ اکثر احادیث ایسی ہیں جن پر آپ کو اپنے شبہات کا جواب خود اسی کتاب کے اسی باب میں مل جاتا اگر آپ پورا باب پڑھنے کی تکلیف گوارا فرماتے۔ بلکہ بعض حدیثوں کے تو آپ نے پورے الفاظ تک نہیں پڑھے ہیں اور ان کا وہی غلط سلط مفہوم نقل کر دیا ہے جو اس فتنہ پرداز گروہ نے اپنی طرف سے گھڑ کر بیان کیا ہے۔ اس طریقے سے یہ لوگ کم سواد لوگوں کو تو دھوکا دے ہی رہے ہیں، مگر یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ آپ جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس آسانی کے ساتھ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ دنیا کے کسی علم و فن کے مسائل پر بھی آدمی اتنے سرسری مطالعے سے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا جسے آپ حدیث کے معاملے میں کافی سمجھ رہے ہیں؟ جس طریقے سے آپ نے حدیث کی چند باتیں سیاق و سباق اور موضوع سے الگ کر کے اور ان کا بالکل ایک سرسری مفہوم اخذ کر کے نقل کی ہیں، اس طریقے سے تو دنیا کے ہر علم و فن کی کتابوں سے اقتباسات نکال کر محض مضحکہ بنانے کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اس مختصر تنبیہ کے بعد میں آپ کی پیش کردہ احادیث میں سے ہر ایک پر مفصل کلام کروں گا، تاکہ نہ صرف آپ کو، بلکہ منکرینِ حدیث کے فتنے سے دھوکا کھانے والے دوسرے اصحاب کو بھی تحقیق کا صحیح طریقہ معلوم ہو سکے۔

(۱) حضرت عائشہؓ کے غسل والی حدیث بخاری کتاب الغسل، باب الغسل بالصاع ونحوہ میں ہے۔ اس میں ابو سلمہؓ بیان فرماتے ہیں کہ "میں اور حضرت عائشہؓ کے بھائی حضرت عائشہؓ کے پاس گئے اور حضرت عائشہؓ کے بھائی نے ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی بابت دریافت کیا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے ایک برتن منگایا جو قریب قریب ایک صاع کے برابر تھا، اور انہوں نے غسل

کیا اور اپنے سر پر پانی بہایا اس حال میں کہ ہمارے اور ان کے درمیان پردہ تھا"۔

اس حدیث پر اعتراض کرنے والوں کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ ابو سلمہ کا نام پڑھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ کوئی غیر شخص تھے۔ حالانکہ وہ حضرت عائشہ کے رضاعی بھانجے تھے جنہیں حضرت ام کلثوم بنت ابی بکر صدیق نے دودھ پلایا تھا۔ پس دراصل یہ دونوں صاحب جو حضرت عائشہؓ سے مسئلہ پوچھنے گئے تھے، آپ کے محرم ہی تھے، ان میں سے کوئی غیر نہ تھا۔

پھر دوسری غلطی، بلکہ زیادتی وہ یہ کرتے ہیں کہ روایت میں تو صرف "حجاب" یعنی پردے کا ذکر ہے، مگر یہ لوگ اپنی طرف سے اس میں یہ بات بڑھا لیتے ہیں کہ وہ پردہ باریک تھا، اور اس اضافے کے لیے وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ اگر باریک نہ ہوتا جس میں سے حضرت عائشہ نہاتی ہوئی نظر آ سکتیں تو پھر اسے درمیان میں ڈال کر نہانے سے کیا فائدہ تھا؟ حالانکہ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ اُس وقت مسئلہ کیا درپیش تھا جس کی تحقیق کے لیے یہ دونوں صاحب اپنی خالہ اور بہن کے پاس گئے تھے، تو انہیں اپنے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا، اور یہ سوچنے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی کہ وہ پردہ باریک ہونا چاہیے تھا۔

دراصل وہاں سوال یہ نہ تھا کہ غسل کا طریقہ کیا ہے۔ بلکہ بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ غسل کے لیے کتنا پانی کافی ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ روایت پہنچی تھی کہ آپ ایک صاع بھر پانی سے غسل کر لیتے تھے۔ اتنے پانی کو لوگ غسل کے لیے ناکافی سمجھتے تھے اور بنائے غلط فہمی یہ تھی کہ وہ غسل جنابت اور غسل بغرض صفائی بدن کا فرق نہیں سمجھ رہے تھے۔ حضرت عائشہ نے ان کو تعلیم دینے کے لیے بیچ میں ایک پردہ ڈالا جس سے صرف ان کا سر اور چہرہ اُن دونوں صاحبوں کو نظر آتا تھا اور پانی منگا کر اپنے اوپر بہایا۔ اس طریقے سے حضرت عائشہ ان کو دو باتیں بتانا چاہتی تھیں۔ ایک یہ کہ غسل جنابت کے لیے صرف جسم پر پانی بہانا کافی ہے، دوسرے یہ کہ اس مقصد کے لیے ایک صاع بھر پانی کفایت کرتا ہے۔

اس تشریح کے بعد آپ خود سوچیں کہ اس میں آخر قابل اعتراض کیا چیز ہے جس کی بنا پر خواہ مخواہ ایک مستند حدیث کا انکار کرنے کی ضرورت پیش آئے، اور پھر اسے تمام حدیثوں کے غیر معتبر ہونے پر دلیل ٹھیرایا جائے؟

(۲-۳) حضرت سَبرۃ الجُہنی اور حضرت جابر والی حدیثیں مسلم باب نکاح المتعۃ میں موجود ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ معترضین نے صرف اعتراض کی خاطر حدیثیں تلاش کرنی شروع کیں، اور اس سلسلہ میں ان دونوں حدیثوں کو بھی اپنی فہرست میں ٹانک لیا۔ ورنہ اگر وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ متعہ کی حقیقت کیا ہے، اور اس کے بارے میں فقہائ کے درمیان کیا بحثیں پیدا ہوئی تھیں، اور ان بحثوں کا تصفیہ کرنے کے لیے محدثین نے کس مقصد کے لیے وہ تمام روایات اپنی کتابوں میں جمع کیں جو متعہ کے جواز اور حرمت کے متعلق ان کو مختلف سندوں سے پہنچی تھیں، تو شاید وہ ان احادیث پر نظرِ عنایت نہ فرماتے۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ اسلام سے قبل، زمانۂ جاہلیت میں نکاح کے جو طریقے رائج تھے، ان میں سے ایک "نکاحِ مُتعہ" بھی تھا، یعنی کسی عورت کو کچھ معاوضہ دے کر ایک خاص مدت کے لیے اس سے نکاح کرنا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کسی چیز کی نہی کا حکم نہ مل جاتا تھا، آپ پہلے کے رائج شدہ طریقوں کو منسوخ نہ فرماتے تھے، بلکہ یا تو ان کے رواج پر سکوت اختیار فرماتے، یا بوقتِ ضرورت ان کی اجازت بھی دے دیتے۔ چنانچہ یہی صورت متعہ کے باب میں بھی پیش آئی کہ ابتداءً آپ نے اس کے رواج پر سکوت اختیار فرمایا، اور بعد میں کسی جنگ یا سفر کے موقع پر اگر لوگوں نے اپنی شہوانی ضرورت کی شدت ظاہر کی تو آپ نے اس کی اجازت بھی دے دی، کیونکہ حکمِ نہی اس وقت تک نہ آیا تھا۔ پھر جب حکمِ نہی آگیا تو آپ نے اس کی قطعی ممانعت فرما دی، لیکن یہ حکم تمام لوگوں تک نہ پہنچ سکا، اور اس کے بعد بھی کچھ لوگ ناواقفیت کی بنا پر متعہ کرتے رہے۔ آخر کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اس حکم کی عام اشاعت کی اور پوری قوت کے ساتھ اس رواج کو بند کیا۔

اس مسئلے میں فقہاء کے سامنے متعدد سوالات تحقیق طلب تھے۔ مثلاً یہ کہ آیا حضور نے کبھی اس کی صریح اجازت بھی دی تھی؟ اور اگر دی تھی تو کس موقع پر؟ اور یہ کہ آپ نے اس سے منع فرمایا ہے یا نہیں؟ اور منع فرمایا ہے تو کب اور کن الفاظ میں؟ اور یہ کہ آیا اس کی تحریم حضور کا اپنا فعل ہے یا حضرت عمرؓ نے اپنی ذمہ داری پر اس رواج کو بند کیا؟ یہ اور اس طرح کے متعدد دوسرے سوالات تھے جن کی تحقیق کے لیے فقہاء و محدثین کو وہ تمام روایات جمع کرنے کی ضرورت پیش آئی جو اس مسئلے سے متعلق

مختلف لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ اسی سلسلے میں امام مسلم نے وہ دونوں روایات بھی نقل کی ہیں جن کو معترضین نے اعتراض کے لیے چھانٹا ہے۔

ان میں سے ایک حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں متعہ کرتے تھے، پھر حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اس کی ممانعت کر دی۔ دوسری حدیث سَبْرَۃ الجُہَنی کی ہے جو بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی تھی، چنانچہ میں نے خود ایک چادر کے عوض ایک عورت سے متعہ کیا، مگر بعد میں اسی غزوے کے زمانے میں آپ نے اعلان فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ نے متعے کو قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث مسلم اور دوسرے محدثین نے جمع کی ہیں جو اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر محدثین یہ مواد جمع نہ کرتے تو اسلامی قانون کی تدوین کرنے والے آخر کس بنیاد پر متعے کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرتے؟

(۳) حضرت جابر کی یہ روایت مسلم، کتاب الحج، باب بیان وجوہ الاحرام میں ہے جس میں قواعدِ احرام سے تعلق رکھنے والی روایات جمع کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں امام مسلم نے حضرت جابر کی بھی متعدد روایات نقل کی ہیں جن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ محض حج کی نیت کر کے مدینہ سے نکلے تھے۔ جب ہم ذی الحجہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ ہدی نہیں لائے ہیں وہ احرام کھول دیں اور اپنی بیویوں کے پاس جائیں۔ یہ آپ کا حکم نہ تھا بلکہ مقصود یہ بتانا تھا کہ احرام کھول کر تم ایسا کر سکتے ہو۔ چنانچہ ہم نے طواف کعبہ اور سعی بین الصفا والمروہ کر کے احرام کھول دیے اور اپنی بیویوں کے پاس گئے۔ اس موقع پر جو لوگ احرام کھولتے ہوئے جھجک رہے تھے انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں، اگر میں اپنے ساتھ ہدی نہ لایا ہوتا تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی احرام کھول دیتا۔ اس پر وہ مطمئن ہو گئے اور سب نے ارشاد کی تعمیل کی۔

یہ واقعات حضرت جابرؓ نے جس غرض کے لیے بیان کیے تھے وہ یہ تھی کہ بعد میں بھی بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ شک باقی رہ گیا تھا کہ جو شخص احرام باندھ کر حج سے پہلے مکے پہنچا ہو، وہ آیا طواف و سعی

کرنے کے بعد حلال ہو سکتا ہے یا نہیں، اور آیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ حج کا زمانہ آنے پر حرم ہی سے احرام کا آغاز کرے۔ اسی شک کو دور کرنے کے لیے حضرت جابرؓ نے زور دے کر کہا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم عرفہ اس حال میں پہنچے ہیں کہ تقطومذا کیرنا المنی۔ اس طرزِ تعبیر پر کسی کا جی چاہے تو ناک بھوں چڑھائے، مگر حضرت جابرؓ کا مقصود ان شک کرنے والوں کو یہ بتانا تھا کہ عرفہ جانے سے ایک ہی دن پہلے ہم مباشرت کر چکے تھے اور تازہ تازہ احرام باندھ کر نکلے تھے، اور یہ ہم نے حضور کی ہدایت کے مطابق کیا تھا، پھر اس مسئلے میں تمہارے شک کرنے کی کیا معقول وجہ ہے۔

(۵) حضرت ابوذر کی یہ حدیث بخاری کتاب بدء الخلق، باب صفت الشمس والقمر میں ہے اس کا جو خلاصہ آپ نے دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جانتے ہو سورج غروب ہو کر جاتا کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا وہ جاتا ہے اور عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے اور اجازت مانگتا ہے (یعنی پھر مشرق سے طلوع ہونے کی) اور اسے اجازت دے دی جاتی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ وہ سجدہ کرے گا اور اجازت مانگے گا مگر اجازت نہ ملے گی اور حکم ہو گا کہ پلٹ جا اور وہ مغرب سے طلوع ہو گا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی والشمس تجری لمستقر لہا ذالک تقدیر العزیز العلیم۔"

اس میں دراصل جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ "سورج ہر آن اللہ تعالیٰ کے حکم کا تابع ہے، اس کا طلوع بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے اور اس کا غروب بھی۔" سورج کا سجدہ کرنا ظاہر ہے کہ اس معنی میں نہیں ہے جس میں ہم نماز میں سجدہ کرتے ہیں۔ بلکہ اس معنی میں ہے جس میں قرآن دنیا کی ہر چیز کو خدا کے آگے سربسجود قرار دیتا ہے، یعنی کلیتہً تابع امرِ رب ہونا۔ پھر سورج کا مغرب بھی ایک نہیں ہے بلکہ قرآن کی رو سے بہت سے مغرب ہیں، کیونکہ وہ ہر آن ایک خطۂ زمین میں غروب اور ہر آن دوسرے خطے میں طلوع ہوتا ہے۔ اس لیے اجازت مانگ کر طلوع و غروب ہونے کا مطلب ہر آن امرِ الٰہی کے تحت ہونا ہے۔ رہا اس کا کسی وقت مغرب سے طلوع ہونا، تو یہ بھی کوئی بعید بات نہیں ہے۔ ہر وقت اس امر کا امکان ہے کہ دنیا کا قانونِ جذب و کشش یکایک

ایک پٹی لکھا جائے اور سیاروں کی رفتار بالکل الٹ جائے۔ طبعیات اور ہیئت کے ماہرین میں سے کوئی بھی اس قانون کو اٹل نہیں مانتا اور نہ اس میں تغیر واقع ہونے، یا اس کے بالکل درہم برہم ہو جانے کو ناممکن سمجھتا ہے۔

رہا یہ امر کہ اس حدیث میں طلوع و غروب کو سورج کی گردش کا نتیجہ سمجھا گیا ہے نہ کہ زمین کی گردش کا، تو اس پر اعتراض کرنے والے کو دو باتیں اچھی طرح جان لینی چاہئیں۔ اول یہ کہ انبیا علیہم السلام طبعیات اور ہیئت اور کیمیا کے مسائل بتانے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ عرفانِ حقیقت بخشنے اور فکر و عمل کی تصحیح کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کا کام یہ بتانا نہ تھا کہ زمین حرکت کرتی ہے یا سورج، بلکہ یہ بتانا تھا کہ ایک ہی خدا زمین اور سورج کا مالک و فرمانروا ہے، اور ہر چیز ہر آن اس کی بندگی کر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بات حکمت تبلیغ کے بالکل خلاف ہے کہ مبلغ کے اپنے زمانے میں جو علم اشیاء موجود ہو اس کو چھوڑ کر وہ ہزار ہا سال بعد کے علمِ اشیاء کو تعلیم حقیقت کا ذریعہ بنائے۔ اُسے جن حقائق کو ذہن نشین کرنا ہوتا ہے اُن کی تفہیم کے لیے اس کو لامحالہ اپنے زمانے ہی کے موادِ علمی سے کام لینا پڑتا ہے، ورنہ اگر وہ اُن معلومات سے کام لے جو صدیوں بعد انسان کے علم میں آنے والی ہوں تو اس کے معاصرین اس کی اصل تعلیم کو چھوڑ کر اس بحث میں لگ جائیں کہ یہ شخص کس عالم کی باتیں کر رہا ہے، اور ان میں کا ایک شخص بھی اس کی تبلیغ سے متاثر ہو کر نہ دے۔ اب آپ خود سوچ لیں کہ اگر کسی نبی کی تعلیم اس کے معاصرین ہی کی سمجھ میں نہ آتی اور اس کے عہد کے لوگوں ہی میں مقبول نہ ہوتی، تو وہ بعد کی نسلوں تک پہنچتی کیسے؟ اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اگر اوپر والی حدیث کا مضمون اس ڈھنگ سے بیان کیا جاتا کہ سننے والا طلوع و غروب کا سبب سورج کے بجائے زمین کی حرکت کو سمجھتا تو بے شک آج کے لوگ اسے علم کا ایک معجزہ قرار دیتے، مگر آپ کا کیا خیال ہے کہ خود اس زمانے کے لوگ اِس معجزۂ علمی کا استقبال کس طرح کرتے؟ اور پھر وہ اصل بات بھی کہاں تک ان کے دل و دماغ میں اترتی جو اس مضمون میں بیان کرنی مقصود تھی؟ اور جبکہ اُس عہد کے لوگ ہی ایسے "علمی معجزات" کی بدولت ایمان لانے سے محروم رہ جاتے تو یہ معجزے آپ تک پہنچتے ہی کب کر

آپ ان کی داد دیتے ؟

(۶) حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت بخاری کتاب مواقیت الصلاۃ، باب الابراد بالظہر فی شدۃ الحر میں ہے۔ اس کا خلاصہ بھی آپ نے صحیح بیان نہیں کیا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب گرمی کا زور ہو تو ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھو (یعنی دیر کر کے پڑھو جبکہ گرمی کی شدت میں کمی ہو جائے) کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے۔ جہنم نے اپنے رب سے شکایت کی اور کہا کہ اے رب میرے اجزاء ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ اس کے رب نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی ایک مرتبہ جاڑے میں اور دوسری مرتبہ گرمی میں۔ گرمی کا سانس اُس شدید ترین گرمی جیسا ہوتا ہے جو تم لوگ موسم گرما میں پاتے ہو، اور سردی کا سانس اس شدید ترین سردی جیسا ہوتا ہے جو تم موسم سرما میں پاتے ہو۔"

اس حدیث پر اعتراض کرنے سے پہلے اس امر پر غور کر لیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد اس بیان سے آخر کیا ہو سکتا تھا؟ کیا یہ کہ آپ ایک عالم طبیعیات کی حیثیت سے موسمی تغیرات کے وجوہ بیان فرمانا چاہتے تھے؟ یا یہ کہ آپ ایک نبی کی حیثیت سے گرمی کی تکلیف محسوس کرنے والوں کو جہنم کا تصور دلانا چاہتے تھے؟ جس شخص نے بھی قرآن اور سیرت نبی پر کچھ غور کیا ہوگا وہ بلا تأمل کہہ دیگا کہ آپ کی حیثیت پہلی نہ تھی بلکہ دوسری تھی، اور گرمی کی شدت کے زمانے میں ظہر کی نماز ٹھنڈی کر کے پڑھنے کا حکم دیتے ہوئے آپ نے جو کچھ فرمایا اس سے آپ کا مقصد دوزخ سے ڈرانا اور ان کاموں سے روکنا تھا جو آدمی کو دوزخ کا مستحق بناتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ کا یہ ارشاد قرآن کے اُس ارشاد سے ملتا جلتا ہے جو غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا گیا تھا کہ وَقَالُوا لَا تَنفِرُوا فِي الْحَرِّ ۗ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا "انہوں نے کہا کہ اس شدید گرمی میں جہاد کے لیے نہ نکلو۔ اے نبی ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس گرمی سے زیادہ گرم ہے۔" جس طرح یہاں قرآن علم طبیعیات کا کوئی مسئلہ بیان نہیں کر رہا ہے، اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی طبیعیات کا درس دینے کے لیے نہیں ہے۔ قرآن دنیا کی گرمی کا جہنم کی گرمی سے مقابلہ اس لیے کر رہا ہے کہ پس منظر میں وہ لوگ موجود تھے جو اس گرمی سے گھبرا کر جہاد کے لیے نکلنے سے

جی چرا رہے تھے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا کی شدید گرمی اور شدید سردی کو دوزخ کی محض دو پھونکوں کے برابر اس لیے بتا رہے ہیں کہ پس منظر میں وہ لوگ موجود تھے جو جاڑے میں صبح کی اور گرمی میں ظہر کی نماز کے لیے نکلنے سے گھبراتے تھے۔ چنانچہ مسند احمد میں زید بن ثابت کی یہ روایت آئی ہے کہ لم یکن یصلی صلوۃ اشد علی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہا "ظہر کی نماز سے بڑھ کر کوئی نماز اصحاب رسول اللہ پر شاق نہ تھی" اور اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس نے گرمی کے زمانے میں عرب کی دوپہر کبھی دیکھی ہو۔

اس کے بعد اب حدیث کے اصل الفاظ کی طرف آئیے۔ فان شدۃ الحر من فیح جہنم (گرمی کی شدت جہنم کی پھونک سے ہے)، کے معنی لازماً یہی نہیں ہیں کہ دنیا میں گرمی جہنم کی پھونک کی وجہ سے ہوتی ہے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ جہنم کی پھونک کی قسم یا جنس سے ہے اس لیے کہ عربی زبان میں لفظ مِن بیان جنس کے لیے بکثرت استعمال ہوتا ہے اور خود قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جیسے ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ۔ مما تنا بہ من ایۃ۔ اور اجتنبوا الرجس من الاوثان۔

رہا آخری فقرہ تو اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ دنیا میں گرمی اور جاڑے کے موسم دوزخ کی ان دو پھونکوں کے سبب سے آتے ہیں، بلکہ الفاظ یہ ہیں فاذن لہا بنفسین، نفس فی الشتاء و نفس فی الصیف اشد ما تجدون من الحر و اشد ما تجدون من الزمہریر (پس اس کے رب نے اس کو دو سانسوں کی اجازت دی۔ ایک سانس جاڑے میں اور ایک سانس گرمی میں، جو ان شدید ترین گرمی جیسا ہے جو تم پاتے ہو اور اس شدید ترین سردی جیسا ہے جو تم پاتے ہو)۔

(۷-۸) یہ حدیثیں مسلم نے کتاب الحیض، باب صفتہ منی الرجل والمرأۃ میں، اور بخاری نے کتاب العلم، کتاب الغسل، کتاب الادب اور کتاب الانبیاء کے مختلف ابواب میں نقل کی ہیں مگر آپ نے ان کا مفہوم بھی غلط نقل کیا ہے۔ اصل بات جو مختلف روایتوں میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے ام سلیم نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر عورت خواب میں وہ کچھ دیکھے جو

مرد دیکھا کرتا ہے (یعنی اس کو احتلام ہو) تو کیا کرے؟ آپ نے فرمایا غسل کرے۔ اس پر حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا "عورت کو بھی یہ معاملہ پیش آتا ہے؟" ان کا مطلب یہ تھا کہ کیا عورت کو بھی انزال اور احتلام ہوا کرتا ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا:

نعم، فمن این یکون الشبه، ان ماء الرجل غلیظ ابیض وماء المرأة رقیق اصفر فمن ایھما علا او سبق یکون منه الشبهُ	ہاں، ورنہ آخر بچہ ماں کے مشابہ کیسے ہو جاتا ہے؟ مرد کا پانی گاڑھا سپیدی مائل ہوتا ہے اور عورت کا پانی پتلا زردی مائل۔ پھر ان میں سے جو بھی غالب آجاتا ہے یا جو بھی سبقت لے جاتا ہے بچہ اسی کے مشابہ ہوتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک خاتون کے سوال پر حضرت عائشہؓ نے بھی اسی طرح کے تعجب کا اظہار کیا تھا اور اس پر حضورؐ نے فرمایا تھا:-

وھل یکون الشَّبَهُ الا من قبل ذالک اذا علا ماءُھا ماءَ الرجل اشبه الولد اخوالهٗ واذا علا ماء الرجل ماءھا اشبه الولد اعمامه	اور کیا بچے کا ماں کے مشابہ ہونا اس کے سوا کسی اور وجہ سے ہوتا ہے؟ جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو بچہ اپنی ننہیال پر جاتا ہے اور جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آتا ہے تو بچہ ددھیال پر جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک یہودی عالم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اولاد کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

ماء الرجل ابیض وماء المرأة اصفر فاذا اجتمعا فعلا منی الرجل منی المرأة اذکرا باذن الله واذا علا منی المرأة منی الرجل آنثا باذن الله	مرد کا پانی سفیدی مائل اور عورت کا پانی زردی مائل ہوتا ہے، جب یہ دونوں ملتے ہیں اور مرد کی منی عورت کی منی پر غالب آتی ہے تو اللہ کے حکم سے بیٹا ہوتا ہے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب آتی ہے تو اللہ کے حکم سے لڑکی ہوتی ہے۔

آپ نے خدا جانے کس لفظ کا مطلب یہ سمجھا کہ "اگر یہ مرکب مائل بہ سفیدی ہو تو بچہ پیدا ہوتا ہے ورنہ بچی" اور یہ کس عبارت کا ترجمہ آپ نے فرمایا ہے کہ "اگر مجامعت کے وقت مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے ورنہ ماں پر"؟ اصل مضمون جو ان احادیث میں بیان ہُوا ہے، اگر اُس کے خلاف علم و عقل کی کوئی شہادت موجود ہو تو ضرور پیش فرمائیں۔

(۹) اس معنی کی روایات بخاری کی کتاب الانبیاء، کتاب الاستیذان اور کتاب العقیقہ میں موجود ہیں۔ مگر ہر جگہ اختتن کے الفاظ ہیں جو صریح طور پر اس مفہوم کے محتمل ہیں کہ حضرت ابراہیم نے اپنے ختنے خود اپنے ہاتھ سے کر لیے۔ اور جبکہ یہ کام ایک شخص خود بھی کر سکتا ہے تو آخر کیوں یہ معنی لیے جائیں کہ ایک ۸۰ برس کی عمر کے شخص نے جراح کو بلا کر یہ کام کرایا ہو گا۔ پھر مسند ابی یعلیٰ کی روایت میں اس کی جو تفصیل آئی ہے وہ بالکل یہ بات واضح کر دیتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے یہ کام خود کر لیا تھا۔ اس میں یہ بیان ہُوا ہے کہ حضرت ابراہیم کو جب اللہ کی طرف سے حکم ہُوا کہ ختنہ کرو تو انہوں نے قدوم (بڑھئی کے کام کا ایک آلہ) لیکر ختنہ کر لیا۔ اس سے ان کو سخت تکلیف ہوئی۔ اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ ابراہیم تم نے جلدی کی، ورنہ ہم تمہیں خود اس کا آلہ بتا دیتے۔ انہوں نے عرض کیا اے رب، مَیں نے پسند نہ کیا کہ تیرے حکم کی تعمیل میں دیر کروں۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۲۴۵)

(۱۰) اس مضمون کی احادیث بخاری کتاب الانبیاء، کتاب الجہاد اور کتاب الأیمان و النذور میں موجود ہیں۔ ان مختلف احادیث میں سے کسی میں حضرت سلیمان کی بیویوں کی تعداد ۶۰، کسی میں ۷۰، کسی میں ۹۰، کسی میں ۹۹ اور کسی میں ۱۰۰ بیان کی گئی ہے اور سب کی سندیں مختلف ہیں۔ اتنی مختلف سندوں سے جو بات محدثین کو پہنچی ہو، اس کے متعلق یہ کہنا تو مشکل ہے کہ وہ بالکل ہی بے اصل ہو گی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہ سے کوئی غلطی ہوئی ہے، یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہونگے۔ ممکن ہے حضور نے یہ فرمایا ہو کہ حضرت سلیمان کی بہت سی بیویاں تھیں جن کی تعداد یہودی ۶۰، ۷۰، ۹۰، ۹۹ اور ۱۰۰ تک

بیان کرتے ہیں، اور حضرت ابوہریرہؓ نے سمجھا ہو کہ یہ حضور کا اپنا بیان ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ حضور نے حضرت سلیمان کے قول کو اس طرح بیان کیا ہو کہ "میں اپنی بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر بیوی سے ایک مجاہد پیدا ہوگا"۔ اور حضرت ابوہریرہؓ یہ سمجھے ہوں کہ "ایک رات میں جاؤنگا"۔ اس طرح کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں سے بعض کو دوسری روایتوں نے صاف کر دیا، اور بعض صاف ہونے سے رہ گئیں۔ زبانی روایتوں میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور اس طرح کی چند مثالوں کو لے کر پورے ذخیرہ حدیث کو ساقط الاعتبار ٹھہرا دینا کسی معقول آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔

رہا انشاءاللہ کا معاملہ، تو یہ کسی روایت میں بھی نہیں کہا گیا ہے کہ حضرت سلیمان نے جان بوجھ کر انشاءاللہ کہنے سے احتراز کیا تھا۔ اس لیے اس میں توہینِ انبیاء کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ الفاظ آپ نے آخر کس روایت میں دیکھے ہیں کہ "کسی نے کہا انشاءاللہ بھی ساتھ ہی کہیے لیکن آپ نے پروا نہ کی"؟ حدیث میں جو الفاظ آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقال لہ صاحبہ ان شاء اللہ فلم یقل"۔ ان کے ساتھی نے ان سے کہا اِن شاءاللہ، مگر انہوں نے نہ کہا"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کے منہ سے یہ بات نکلی تو پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے خود کہا "اِن شاءاللہ" اور حضرت سلیمانؑ نے اس کے کہہ دینے کو کافی سمجھ لیا اور اپنی زبان سے اس کا اعادہ نہ کیا۔

(۱۱) یہ حدیث بخاری کتاب الوضوء کے متعدد ابواب میں آئی ہے، اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے، مگر کسی میں بھی حضرت حُذیفہ کے یہ الفاظ نہیں ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کیا"۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ الفاظ آپ کو کہاں ملے؟ ان کے تو اصل الفاظ یہ ہیں کہ "میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم چلے جا رہے تھے کہ راستے میں آپ ایک کوڑے کے ڈھیر کی طرف گئے جو ایک دیوار کے پیچھے تھا اور آپ کھڑے ہوئے جیسے تم میں سے کوئی کھڑا ہوتا ہے اور آپ نے پیشاب کیا۔ میں ہٹ کر دور جانے لگا تو آپ نے مجھے اشارہ کیا اور میں آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ آپ فارغ ہو گئے"۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے دیوار اور ڈھیر کے درمیان

کھڑے ہو کر پیشاب کیا تاکہ دونوں طرف سے پردہ رہے، اور حضرت حذیفہؓ کو روک کر پیچھے کھڑا کیا، کیونکہ اس صورت میں نظر آنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مستند روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیشاب کرتے تھے، مگر اس موقع پر آپ نے کسی عذر کی وجہ سے ایسا کیا تھا۔ اور حضرت حذیفہ نے یہ روایت اس لیے بیان کی تھی کہ اُن کے زمانے میں بعض لوگ پیشاب کے معاملے میں زیادہ شدت برتنے لگے تھے

(۱۲) یہ روایات بخاری کتاب احادیث الانبیاء، اور مسلم باب اثبات الشفاعۃ میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں بھی آئی ہیں۔ ان سب روایات کی اسناد کو اور ان کی کثرت طرق کو دیکھنے کے بعد اس امر میں تو کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حضرت ابوہریرہؓ ہی ان کے راوی ہیں، کیونکہ اتنے کثیر راویوں کے بارے میں، خصوصاً جبکہ اُن میں سے اکثر و بیشتر ثقہ تھے، یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے ایک صحابی کا نام لے کر قصداً ایک غلط روایت تصنیف کی ہو گی۔ رہے حضرت ابوہریرہ تو اُن پر ہم یہ شُبہ تک نہیں کر سکتے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب کریں گے۔ لیکن ہمارے لیے ان راویوں کو جھوٹا ماننا جس قدر مشکل ہے اس سے بدرجہا زیادہ مشکل یہ باور کرنا ہے کہ ایک نبی نے جھوٹ بولا ہو گا، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ، ایک نبی پر دروغ گوئی کا جھوٹا الزام لگایا ہو گا۔ اس لیے لامحالہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اِس معاملہ میں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صحیح طور پر نقل نہیں ہوا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے جو تین "جھوٹ" اس روایت میں بیان ہوئے ہیں ان میں سے دو تو قطعاً جھوٹ نہیں ہیں، اور تیسرا جھوٹ دراصل بنی اسرائیل کا جھوٹ ہے جو انہوں نے بائیبل میں ایک جگہ نہیں بلکہ دو مقامات پر حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کیا ہے۔

پہلے دو واقعات خود قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں، مگر نہ ان میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ نے جھوٹ قرار دیا، اور نہ صورتِ واقعہ سے ان کے جھوٹ ہونے کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے کنبے قبیلے کے لوگ اپنے ایک مشرکانہ میلے کے لیے شہر سے باہر

جانے لگے تو آپ یہ عذر کر کے پیچھے ٹھیر گئے کہ اِنِّی سَقِیْمٌ (میں بیمار ہوں)۔ اس کو جھوٹ قرار دینے کے لیے کسی مستند ذریعہ سے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اُس وقت بالکل تندرست تھے، کسی قسم کی شکایت اُن کو نہ تھی لیکن یہ بات نہ اللہ نے بتائی نہ اس کے رسولؐ نے۔ پھر اسے آخر کس بنا پر جھوٹ کہا جائے؟ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے بت خانے میں گھس کر بڑے بُت کے سوا باقی سارے بُت توڑ دیے، تو قوم کے لوگوں نے تلاش شروع کی کہ یہ فعل کس نے کیا ہے۔ بعض لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ پر شبہ ظاہر کیا۔ چنانچہ وہ بلائے گئے اور ان سے پوچھا گیا کہ تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ انہوں نے جواب دیا بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ۔ (بلکہ یہ فعل ان کے اِس بڑے نے کیا ہے، اِن زخمی بتوں سے پوچھ لو اگر یہ بول سکتے ہیں)۔ اِس فقرے کے الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات ایک جھوٹے بیان کی حیثیت سے نہیں بلکہ شرک کے خلاف ایک دلیل کی حیثیت سے فرمائی تھی۔ ان کا مدعا دراصل پوچھنے والوں کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا تھا کہ تمہارے یہ کیسے خدا ہیں جو بیچارے اپنی داستانِ مصیبت تک نہیں سنا سکتے۔ اس بات کو تو کوئی معمولی سخن فہم آدمی بھی جھوٹ نہیں کہہ سکتا، کجا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بدگمانی کریں کہ آپ نے اسے جھوٹ قرار دیا ہوگا۔

رہا تیسرا "جھوٹ" تو وہ دراصل اُن مہمل افسانوں میں سے ایک ہے جو بائیبل میں انبیاءؑ کے نام پر گھڑے گئے ہیں۔ بائیبل کی کتاب پیدائش میں یہ واقعہ ایک جگہ نہیں بلکہ دو جگہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلا واقعہ مصر کا ہے اور وہ بائیبل کے الفاظ میں یہ ہے:-

> اس نے اپنی بیوی سارَی سے کہا کہ دیکھ مَیں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوبصورت عورت ہے، اور یوں ہوگا کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اس کی بیوی ہے۔ سو وہ مجھے تو مار ڈالیں گے مگر تجھے زندہ رکھ لیں گے۔ سو تو یہ کہہ دینا کہ مَیں اس کی بہن ہوں . . . . مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے . . . . اور وہ عورت فرعون کے گھر میں پہنچائی گئی . . . . پر خداوند نے فرعون اور اس کے خاندان پر ابرام کی بیوی کے سبب سے

بڑی بڑی بلائیں نازل کیں۔ تب فرعون نے ابرام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے یہ مجھ سے کیا کیا؟ تو نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ یہ تیری بیوی ہے؟ تو نے یہ کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ اسی لیے میں نے اُسے لیا کہ وہ میری بیوی بنے۔" (باب ۱۲۔ آیات ۱۱ تا ۲۰)

لطف یہ ہے کہ خود بائیبل ہی کے بیان کے مطابق اُس وقت حضرت سارہ کی عمر ۶۵ سال تھی۔ اس کے بعد دوسرا واقعہ فلسطین کے جنوبی علاقے کا بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے:

"ابرہام نے اپنی بیوی سارہ کے حق میں کہا کہ وہ میری بہن ہے اور جرار کے بادشاہ ابی ملک نے سارہ کو بلوا لیا۔ لیکن رات کو خدا ابی ملک کے پاس خواب میں آیا اور اسے کہا کہ دیکھ تو اُس عورت کے سبب سے جسے تو نے لیا ہے ہلاک ہو گا کیونکہ وہ شوہر والی ہے۔ ۔ ۔

۔ ۔ اور ابی ملک نے ابرہام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے ہم سے یہ کیا کیا اور مجھ سے تیرا کیا قصور ہوا کہ تو مجھ پر اور میری بادشاہی پر ایک گناہِ عظیم لایا؟" (باب ۲۰۔ آیات ۲ تا ۱۶)

بائیبل کے اپنے بیان کی رو سے اُس وقت حضرت سارہ کی عمر ۹۰ سال کی تھی۔ یہ دونوں قصے خود بتا رہے ہیں کہ یہ سراسر جھوٹے ہیں، اور ہم کسی طرح یہ باور نہیں کر سکتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق فرمائی ہو گی۔

اب ایک شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر یہ تینوں باتیں از روئے درایت غلط ہیں تو اہلِ روایت نے ان احادیث کو اپنی کتابوں میں درج ہی کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درایت کا تعلق احادیث کے نفسِ مضمون سے ہے، اور روایت کا تعلق تمام تر سند سے۔ اہلِ روایت نے جو خدمت اپنے ذمے لی تھی وہ دراصل یہ تھی کہ قابلِ اعتماد ذرائع سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے متعلق جتنا مواد ان کو ہم پہنچے اسے جمع کر دیں۔ چنانچہ یہ خدمت انہوں نے انجام دے دی۔ اس کے بعد یہ کام اہلِ درایت کا ہے کہ وہ نفسِ مضامین پر غور کر کے ان روایات سے کام کی باتیں اخذ کریں۔ اگر اہلِ روایت خود اپنی اپنی فہم کے مطابق درایت کا کام بھی کرتے اور مضامین پر تنقید کر کے اُن ساری روایتوں کو رد کرتے جاتے جن کے مضمون ان کی انفرادی رائے میں مناسب نہ ہوتے، تو ہم اُس بہت

سے مواد سے محروم رہ جاتے جو مجموعۂ احادیث مرتب کرنے والوں کے نزدیک کام کا نہ ہوتا اور دوسرے بہت سے لوگوں کے نزدیک کام کا ہوتا۔ اس لیے یہ عین مناسب تھا کہ اہل روایت نے زیادہ تر تنقید اسناد تک اپنے کام کو محدود رکھا اور تنقید مضامین کی خدمت انجام دینے والوں کے لیے معتبر اسناد سے بہم پہنچا ہوا مواد جمع کر دیا۔

(۱۳) یہ حدیث بخاری، کتاب بدء الخلق، باب خیر مال المسلم غنم تتبع بہا شعف الجبال، اور کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا میں آئی ہے۔ اس مضمون کی تمام احادیث کو جمع کرنے سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "وزغ"[1] کو موذی جانوروں میں سے قرار دیا تھا[2] اور بعض روایات کی رو سے یہ بھی فرمایا تھا کہ دوسرے موذی جانوروں کی طرح اسے بھی مار دیا جائے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کی صحیح ترین روایت جو بخاری میں آئی ہے اس میں وہ فرماتی ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال للوزغ الفویسق ولم اسمعہ امر بقتلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وزغ کو فویسق (موذی) فرمایا، مگر میں نے یہ نہیں سنا کہ آپ نے اسے مار ڈالنے کا بھی حکم دیا ہو۔

دوسری ایک روایت جو مسند احمد اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، اس میں مار دینے کا بھی ذکر ہے اور حضرت ابراہیمؑ پر آگ پھونکنے کا بھی، مگر جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے، والذی فی الصحیح اصح، یعنی صحیح بخاری والی روایت ہی زیادہ صحیح ہے۔

پھر بخاری کی اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ وزعم سعد بن ابی وقاص ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم امر بقتلہ۔ یعنی "سعد بن ابی وقاص کا دعویٰ یہ تھا کہ حضورؐ نے اسے مار ڈالنے کا حکم دیا"

---

[1] وزغ کے اصل معنی گرگٹ کے ہیں نہ کہ چھپکلی۔

[2] حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند جانوروں کو فواسق (موذی) قرار دے کر فرمایا تھا کہ انہیں حرم میں اور حالت احرام میں مار دینے کی بھی اجازت ہے۔ بچھو، باؤلا کتا اور چوہا بھی ان میں شامل ہے۔

لیکن اس روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص سے یہ بات کس نے سنی۔ دارقطنی میں یہ روایت اس طرح ہے کہ عن ابن شہاب عن سعد بن ابی وقاص۔ مگر ابن شہاب نے حضرت سعد کو نہیں دیکھا۔ اس لیے یہ روایت منقطع ہے۔

آخر میں ام شریک کی روایت آتی ہے جس میں مار ڈالنے کے حکم کی بھی تصریح ہے اور اس وجہ کی بھی کہ یہ جانور حضرت ابراہیم پر آگ پھونکتا تھا۔ ممکن ہے اس میں دو چیزیں خلط ملط ہو گئی ہوں۔ ایک اس جانور کا موذی ہونا، جو صحیح ترین روایت کی رُو سے حضور نے فرمایا تھا، دوسرے اس کے بارے میں آگ پھونکنے کا وہ قصہ جو عوام میں مشہور تھا۔ تاہم اگر صحیح بات وہی ہو جو ام شریک والی روایت میں آئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گرگٹ کی پوری نسل کو اس لیے مار ڈالا جائے کہ اس کے ایک فرد نے حضرت ابراہیم پر آگ بھڑکائی تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک موذی جانور ہے اور اس کو دوسرے موذی جانوروں کی طرح انسان سے دشمنی ہے، چنانچہ سارے جانوروں میں سے یہی وہ جانور تھا کہ جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا گیا تو اس نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ گرگٹ کی پھونک میں آگ بھڑکانے کی طاقت کہاں سے آئی اس لیے کہ حدیث میں سرے سے یہ کہا ہی نہیں گیا ہے کہ وہ آگ اس کے بھڑکانے سے بھڑکی تھی۔

(۴) یہ روایت مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب سترۃ المصلی میں ہے۔ اس میں امام مسلم نے وہ پورا مواد جمع کیا ہے جو سترے کے مسئلے سے متعلق ان کو معتبر سندوں سے پہنچا تھا، اور اس کے سارے پہلو ہمارے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اس کی کسی ایک روایت کو لے کر کوئی نتیجہ نکال بیٹھنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ساری روایتوں پر جامع نگاہ ڈالنے سے ہی آدمی صحیح نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ اصل بات جو ان احادیث سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازی کو اپنے آگے سترہ رکھنے کا حکم دیا تھا اور اس کی وجہ سمجھاتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ اگر آدمی سترہ رکھے بغیر نماز کے لیے کسی کھلی جگہ کھڑا ہو جائے گا تو عورتیں، کتے، گدھے سب اس کے سامنے سے گذریں گے۔ اس

بات کو سن کر بعض لوگ اس مسئلے کو یوں بیان کرنے لگے کہ عورت، کتّے اور گدھے کے گذرنے سے نماز قطع ہو جاتی ہے۔ یہ باتیں جب حضرت عائشہ کو پہنچیں تو انہوں نے فرمایا ان المرأة لدابة سوء (عورت تو بڑی بُری جانور ہوئی)، عدلتمونا بالکلاب والحمر (تم لوگوں نے تو ہم کو گدھوں اور کتوں کے برابر کر دیا)، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یصلی من اللیل وانا معترضة بینه وبین القبلة کاعتراض الجنازة (نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو رات کو نماز پڑھتے تھے اور میں ان کے اور قبلے کے درمیان جنازے کی طرح پڑی ہوتی تھی)۔

(۵) اس مضمون کی روایات بخاری نے کتاب بدء الخلق اور کتاب الطب میں نقل کی ہیں۔ نیز ابن ماجہ، نسائی، ابوداؤد اور دارقطنی میں بھی یہ موجود ہیں۔ بعض شارحین نے اس حدیث کے الفاظ کو ٹھیک ان کے لغوی معنی میں لیا ہے اور اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ فی الواقع مکھی کے ایک پر میں زہر اور دوسرے پر میں اُس کا تریاق پایا جاتا ہے، اس لیے جب یہ کسی کھانے پینے کی چیز میں گر جائے تو اسے ڈبو کر نکالا جائے۔ اور بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دراصل اُس بیجا غرور کا علاج کرنا چاہتے تھے جس کی بنا پر بعض لوگ دودھ کے اُس پیالے یا سالن کی اس پوری رکابی سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں جس میں مکھی گری ہو، اور پھر یا تو اسے پھینک دیتے ہیں، یا اپنے خادموں کو کھانے کے لیے دے دیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کا غرور توڑنے کے لیے آپ نے فرمایا کہ مکھی اگر تمہارے کھانے میں گر جائے تو اسے ڈبو کر نکالو اور پھر اس کھانے کو کھاؤ۔ اس کے ایک پر میں بیماری ہے، یعنی کبر و غرور کی بیماری جو اسے دیکھ کر تمہارے نفس میں پیدا ہوتی ہے، اور دوسرے پر میں اس کا تریاق، یعنی اُس کبر و غرور کا علاج جس کی وجہ سے تم ایسے کھانے کو پھینک دیتے ہو یا اپنے خادموں کو کھلاتے ہو۔ اس معنی کی تائید وہ احادیث بھی کرتی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں تھوڑا سا کھانا چھوڑ کر اٹھ جانے کو ناپسند فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ اپنی رکابی کو صاف کر کے اٹھو۔ اس حکم کی وجہ بھی یہی ہے کہ جو شخص اس طرح برتن میں کچھ چھوڑ کر اٹھتا ہے وہ گویا یہ چاہتا ہے کہ یا تو اس بقیہ کھانے کو پھینک دیا جائے، یا اسے کوئی دوسرا کھائے۔

آخری سوال جو آپ نے بخاری کے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" ہونے کے بارے میں کیا ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ یقینی ذریعے سے تو ہم کو کتاب اللہ پہنچی ہے، کیونکہ اسے ہزارہا آدمیوں نے تواتر نقل کیا ہے۔ مگر اس کے بعد جس کتاب کے مندرجات ہم کو معتبر ترین سندوں سے پہنچے ہیں وہ بخاری ہے، کیونکہ دوسری تمام کتابوں کی بہ نسبت اس کتاب کے مصنف نے سندوں کی جانچ پڑتال زیادہ کی ہے۔ یہ صحت کا حکم صرف اسناد سے متعلق ہے اور یقیناً بالکل صحیح ہے۔ رہی مضامین کی تنقید بلحاظ درایت، تو اس کے متعلق میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ یہ کام اہل روایت کے فن سے بڑی حد تک غیر متعلق تھا، اس لیے یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی جان لینے کی ہے کہ کسی روایت کے سنداً صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا نفس مضمون بھی ہر لحاظ سے صحیح اور جوں کا توں قابل قبول ہو۔ ہم کو خود اپنی زندگی میں بارہا اس امر کا تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ ایک شخص کی گفتگو کو جب سننے والے دوسروں کے سامنے نقل کرتے ہیں تو صحیح روایت کی کوشش کرنے کے باوجود ان کی نقل میں مختلف قسم کی کوتاہیاں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً کسی کو پوری بات یاد نہیں رہتی اور وہ اس کا صرف ایک حصہ نقل کرتا ہے۔ کسی کی سمجھ میں بات اچھی طرح نہیں آتی اس لیے وہ ناقص مفہوم ادا کرتا ہے۔ کوئی دوران گفتگو میں کسی وقت پہنچتا ہے اور اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ پہلے کیا بات ہو رہی تھی۔ اس طرح کے متعدد نقائص ہونے کی وجہ سے بسا اوقات نیک نیتی اور صداقت کے باوجود قائل کی بات اپنی صحیح صورت میں نقل نہیں ہوتی۔ اور ایسا ہی معاملہ حالات اور افعال کی روداد بیان کرنے میں بھی پیش آیا کرتا ہے۔ کبھی ان نقائص کو دوسری روایتیں رفع کر دیتی ہیں اور سب کو ملا کر دیکھنے سے پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور کبھی ایک ہی روایت موجود ہوتی ہے جسے اصطلاح علم حدیث میں غریب کہتے ہیں، اس لیے وہ نقص علم روایت کی مدد سے رفع نہیں کیا جا سکتا اور درایت سے کام لے کر یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ اصل بات کیا ہو سکتی تھی، یا یہ کہ یہ بات اپنی موجودہ صورت میں قابل قبول ہے یا نہیں، یا یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اور انداز گفتگو سے یہ چیز مناسبت رکھتی ہے یا نہیں اس حد تک۔ حدیث میں تحقیق کرنے کی صلاحیت جن لوگوں میں نہ ہو، انہیں اول تو حدیث کی کتابیں پڑھنی ہی نہیں چاہئیں، یا پڑھیں تو کم از کم ان کو فیصلے صادر نہ کرنے چاہئیں۔

رسائل و مسائل

پوسٹ مارٹم اور دیگر طبی مسائل

سوال: سابق خط کے جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ آپ نے لکھا ہے "کہ پوسٹ مارٹم کی ضرورت بھی مسلّم ہے اور احکامِ شرعیہ میں شدید ضرورت کے بغیر اس کی گنجائش بھی نظر نہیں آتی" مگر مشکل یہ ہے کہ طبی نقطۂ نگاہ سے کم از کم اُس مریض کی لاش کا پوسٹ مارٹم تو ضرور ہونا چاہیے جس کے مرض کی تشخیص نہ ہو سکی ہو یا ہونے کے باوجود علاج بیکار ثابت ہوا ہو۔ اسی طرح "طبی قانونی" (Medico-legal) نقطۂ نظر سے بھی نوعیتِ جرم کی تشخیص کے لیے پوسٹ مارٹم لازمی ہے۔ علاوہ ازیں اناٹومی، فزیالوجی اور آپریٹو سرجری کی تعلیم بھی جسدِ انسانی کے بغیر ناممکن ہے۔ آپ واضح فرمائیں کہ ان صورتوں پر شرعاً شدید ضرورت کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں؟

آپ نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "آج کل الکوہل کو ایک اچھا محلّل ہونے کی حیثیت سے دوا سازی میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن جب فنِ دوا سازی کو مسلمان بنایا جائے گا تو الکوہل کے استعمال کو ترک کر دیا جائے گا" لیکن کیمیاوی اصطلاح میں الکوہل کے لفظ کا اطلاق صرف نشہ آور اجزاء پر نہیں ہوتا، بلکہ یہ علم الکیمیا میں اشیاء کے ایک خاص گروپ کا نام ہے جس میں مُسکرات کے علاوہ اور بہت سی چیزیں شامل ہیں، تو کیا پھر ان سب اشیاء کا استعمال ناجائز ہو گا؟ علاوہ ازیں الکوہل کا جسم پر خارجی استعمال بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ صرف محلّل ہی نہیں بلکہ جراثیم کُش بھی ہے۔ کیا یہ استعمال بھی ممنوع ہے؟

تفہیم القرآن میں آپ نے ایک مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان اطبا دوا سازی میں الکوہل

---

[1] سائل کا پچھلا خط اور اس کا جواب ترجمان القرآن بابت ماہ اپریل و مئی ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

کے بجائے شہد استعمال کرتے تھے۔ نیز آپ نے وہاں یہ مشورہ بھی دیا ہے، کہ شہد کی مکھی کو خاص جڑی بوٹیوں سے رس حاصل کرنے کی تربیت دے کہ اس سے دوا سازی میں مدد لی جا سکتی ہے۔ ترقی فن کے موجودہ دور میں آپ کا شہد کو الکوہل کا بدل تجویز کرنا اور شہد کی مکھی کی تربیت کا مشورہ دینا میری سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔

اب میں مختصراً چند سوالات عرض کرتا ہوں، جن کے جوابات کی ضرورت ہے :۔

۱۔ کسی مریض کی جان بچانے کے لیے اس کے جسم میں خون داخل کرنا بعض علماء کے نزدیک ناجائز ہے۔ آپ کی تحقیق اس بارے میں کیا ہے؟

۲۔ بعض دواؤں کے اجزاء انسانی یا حیوانی پیشاب، خون یا گوشت سے حاصل کیے جاتے ہیں، اور بعض دوائیں وہیل مچھلی کے غدود سے نکالی جاتی ہیں۔ ایسی دواؤں کا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

۳۔ ڈاکٹر کے لیے فیس کا تعین یا اس کا مطالبہ جائز ہے یا اسے مریض کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے؟

۴۔ سائنس کے مختلف شعبوں کے مطالعہ کرنے کے سلسلے میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے؟

۵۔ غذاؤں اور دواؤں کی حلت و حرمت کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟

۶۔ مسلم اطباء نے طب کو اسلام کا پابند بنانے کے سلسلے میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں؟

جواب :۔ (۱) پوسٹ مارٹم کے مسئلے میں، جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، مجھے خود بڑا خلجان ہے اور کوئی فیصلہ کن بات کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ اس معاملے کے دو مختلف پہلو ہیں جن کے تقاضے ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔

ایک طرف شرعی احکام ہیں جو مرنے والے انسانوں کے جسم کا احترام کرنے اور ان کو عزت کے ساتھ دفن کر دینے کی تاکید کرتے ہیں، اور اگر وہ مسلمان ہوں تو ان کی تجہیز و تکفین کر کے نماز جنازہ پڑھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ان شرعی احکام کی تائید ان لطیف انسانی حسیات سے بھی ہوتی ہے جو

(شاید ڈاکٹروں اور بالکل سائنٹسٹ قسم کے لوگوں کے سوا) سب ہی انسانوں میں موجود ہوتے ہیں۔ کوئی آدمی خوشی سے یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، بہن اور ماں کی لاشیں ڈاکٹروں کے حوالے کی جائیں اور وہ اُن کی چیر پھاڑ کریں۔ یا وہ میڈیکل کالج کے طالب علموں کو دے دی جائیں تاکہ وہ ان کے ایک ایک عضو کا تجزیہ کریں اور پھر ان کی ہڈیاں سکھا کر رکھ لیں۔ اسی طرح کوئی قوم بھی یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے لیڈر اور پیشوا مرنے کے بعد پوسٹ مارٹم کے تختۂ مشق بنائے جائیں۔ ابھی حال میں گاندھی جی اور لیاقت علی خاں مرحوم گولی کے شکار ہوئے ہیں۔ طبی قانونی نقطۂ نظر سے ضروری تھا کہ ان کا پوسٹ مارٹم کر کے سبب موت کی تشخیص کی جاتی۔ مگر اس سے احتراز کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ قومی جذبات اپنے محترم لیڈروں کی لاشوں کا چیرنا پھاڑنا برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

دوسری طرف طبی اور قانونی اغراض کے لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہے۔ طب کے مختلف شعبوں کی تعلیم اور طبی تحقیقات کی ترقی کے لیے اس کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایک حد تک قانون بھی اس کا تقاضا کرتا ہے کہ قتل کے مقدمات میں سبب موت کا تعین کیا جائے۔

اب یہ ایک بڑا پیچیدہ سوال ہے کہ ان دونوں متصادم تقاضوں کے درمیان مصالحت کیسے کی جائے۔ اس کا یہ حل تو میرے نزدیک سخت مکروہ ہے کہ امیروں اور غریبوں، بڑے لوگوں اور چھوٹے لوگوں، خاندان والوں اور لاوارثوں کی لاشوں کے معاملے میں ہمارے پاس دو مختلف معیارِ اخلاق اور دو مختلف طرزِ عمل ہوں۔ اس لیے لامحالہ اس کا کوئی اور ہی حل سوچنا پڑے گا۔ مگر وہ حل کیا ہو، اس باب میں میری قوتِ فیصلہ بالکل عاجز ہے۔ یہ چیز کسی ایسی مجلس میں زیرِ بحث آنی چاہیے جس میں علمائے دین بھی شامل ہوں اور شعبۂ طب اور شعبۂ عدالت کے نمائندے بھی۔ ممکن ہے یہ لوگ سر جوڑ کر اس کا کوئی حل نکال سکیں۔

(۲) الکوہل کے بارے میں مختصر گذارش یہ ہے کہ اس سے مراد وہ الکوہل نہیں ہے جو مختلف قدرتی اشیاء میں بطور ایک جزو کے موجود ہوتی ہے یا کسی خاص مرحلے پر ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے

بلکہ وہ الکوہل ہے جو اشیاء میں سے برآمد کر لی جاتی ہے اور ایک نشہ آور مادے کی حیثیت سے قابلِ استعمال ہوتی ہے۔ یہ چیز چونکہ اصل مادۂ نشہ آور (ام الخبائث کی والدہ) ہے، اس لیے اس کا کوئی اندرونی استعمال جائز نہیں ہے، قطع نظر اس سے کہ جس تناسب سے وہ کسی دوا میں ملائی جائے وہ بالفعل نشہ آور ہو یا نہ ہو۔ البتہ اس کے بیرونی استعمال کو جائز رکھا جا سکتا ہے۔

کیا آپ اپنے فن کے نقطۂ نظر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھانے اور پینے کی دواؤں میں کوئی دوسری چیز الکوہل کا بدل نہیں ہو سکتی؟ اور یہ کہ اس کا استعمال بہر حال ناگزیر ہے؟ میرے دوستوں میں ایسے متعدد ڈاکٹر ہیں جنہوں نے الکوہل کے بارے میں میرے نقطۂ نظر کی تائید کی ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ اس کے دوسرے بدل موجود ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض نے تو اندرونی استعمال کی دواؤں میں اس سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔

(۳) شہد کے بارے میں میں نے تفہیم القرآن میں جو کچھ لکھا تھا اس سے مقصود شہد اور الکوہل کا مقابلہ کرنا نہ تھا۔ میرا مدعا یہ تھا کہ مسلمانوں کے ہاں فن طب کے رواج سے پہلے، جب یہ فن غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھا، دواؤں کو محفوظ کرنے کے لیے حرام و حلال کی تمیز کیے بغیر ہر طرح کی چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔ مگر جب یہ فن مسلمانوں کے پاس آیا تو انہوں نے حلال چیزوں کی طرف توجہ کی اور دواؤں کو ان کی مفید صورت میں برقرار رکھنے کے لیے ان کے پاس ایک اہم ذریعہ شہد تھا جو خود بھی ایک مدت تک خراب نہیں ہوتا اور اپنے اندر دوسری چیزوں کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ بعد میں جب یہ فن پھر ایسے لوگوں کے قبضے میں چلا گیا جو حرام و حلال کی تمیز سے واقف نہیں ہیں، تو پھر حرام چیزیں آزادی کے ساتھ استعمال ہونے لگیں جن میں سے ایک نمایاں چیز یہ الکوہل ہے۔

دوسری بات جس سے آپ اتفاق نہیں کر سکے ہیں، دوا سازی کے فن کی تمام ترقیات کے باوجود اس لائق ہے کہ اہلِ فن اس کی طرف توجہ کریں۔ میرا خیال یہ نہیں ہے کہ سب تدابیر کو چھوڑ کر صرف ایک شہد کی مکھی پر انحصار کر لیا جائے۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ شہد کی مکھی بھی فن دوا سازی کی ایک اچھی خادم بن سکتی ہے۔

(۴) آدمی کی جان بچانے کے لیے اس کے جسم میں خون داخل کرنا میرے نزدیک تو جائز ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کو حرام کہنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ غالباً اسے خون پینے اور خون کھانے پر قیاس کر کے کسی صاحب نے حرام کہا ہوگا، لیکن میرے نزدیک ان دونوں چیزوں میں فرق ہے۔ غذا کے طور پر خون پینا اور کھانا بلاشبہ حرام ہے مگر جان بچانے کے لیے مریض یا زخمی آدمی کے جسم میں خون داخل کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح حالتِ اضطرار میں مردار یا خنزیر کھانا۔

(۵) مختلف جسمانی دواؤں کے بارے میں جو سوالات آپ نے کیے ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ مولاً ہر وہ چیز حرام ہے جو مردار یا حرام جانور سے حاصل کی جائے، یا حلال جانور کی کسی ناپاک یا حرام چیز سے حاصل کی جائے۔ اور اصولاً ایک حرام چیز کا استعمال صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جبکہ انسانی جان بچانے کے لیے وہ ناگزیر ہو۔ ان دو اصولوں کو ملحوظ رکھ کر مسلمان اہلِ فن کو دواؤں کا جائزہ لینا چاہیے اور پھر خود رائے قائم کرنی چاہیے، کیونکہ اپنے فن کو وہ آپ ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت جو اہلِ فن پائے جاتے ہیں وہ نہ محقق، موجد اور مکتشف ہیں اور نہ دوا سازی کی صنعت ہی اُن کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی فن دانی اس سے آگے نہیں جاتی کہ دوسروں نے (اور یہ دوسرے وہ ہیں جو کسی کتابِ الٰہی اور کسی شریعتِ نبوی کے پیرو نہیں ہیں) جو کچھ اپنی تحقیق و اکتشاف سے نکالا ہے صرف اُس سے واقف ہو جائیں، اور پھر وہی لوگ جو کچھ جس طرح بنا کر بھیج دیں اسے یہ استعمال کریں۔ یہ بیچارے اس قابل بھی نہیں ہیں کہ انہوں نے اگر کسی مرض کی دوا حرام طریقے سے پیدا کی ہے تو یہ اپنی تحقیق سے اس کا کوئی دوسرا جائز بدل پیدا کر سکیں یا محققانہ طریقے پر کم از کم یہی کہہ سکیں کہ اس کا بدل نہیں مل سکتا اور اس کا استعمال فی الواقع ناگزیر ہے۔ اس حالت میں ہم غیر فنی لوگ محض حلال و حرام کی بحث کر کے آخر کیا مفید خدمت کر سکتے ہیں؟

وھیل مچھلی جائز ہے۔ اسی قسم کی ایک مچھلی صحابہ کرام ایک جنگی سفر کے دوران میں کھا چکے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جائز رکھا ہے۔

(۶) ڈاکٹر کی فیس اصولاً تو جائز ہے، مگر ڈاکٹروں نے بالعموم فیس کے معاملے میں ایسے طریقے اختیار

کرنے شروع کر دیئے ہیں جو گناہ اور ظلم اور سخت قساوت کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ہماری یہ رائے ہے کہ تمام ڈاکٹروں کو اسٹیٹ سے کافی وظیفے ملنے چاہئیں اور انہیں مریضوں کا مفت علاج کرنا چاہیے۔

(۷) سائنس کے مختلف شعبوں کے مطالعے میں اسلام کی رہنمائی کیا ہے، اس سوال کا جواب ایک مفصل مضمون چاہتا ہے، مگر میں مختصراً آپ کو اس کے لیے چند اشارے دیتا ہوں۔

سائنس کا جو شعبہ بھی آپ لیں، وہ بہر حال کائنات کے کسی ایک جز کی ماہیت اور خصوصیات کو اور ان قوانینِ فطرت کو جو اس میں کارفرما ہیں، مشاہدے اور تجربے کی مدد سے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اس تحقیق و تجسس میں دو چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک یہ کہ تحقیق کرنے والا انسان پہلے بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا (جس کے کسی جز پر وہ اپنی توجہ مرکوز کر رہا ہے) ایک صحیح و جامع تصور رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ خود اپنی حقیقت اور حیثیت کو اور اپنے حدود کو ٹھیک سمجھتا ہو۔ اِن دو چیزوں کے بغیر الگ الگ اجزا کی تحقیقات (جو بہر حال صرف تجربہ و مشاہدے میں آنے والے امورِ واقعیہ تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ کسی نہ کسی فلسفیانہ نظریے کی تشکیل بھی کرتی ہے) مشکل ہی سے کسی صحیح نتیجے پر انسان کو پہنچا سکتی ہے۔ اُس کا حاصل، عملی ایجادات سے قطع نظر، فلسفیانہ حیثیت سے اگر کچھ ہے تو یہ کہ ایسی تحقیقات ہمارے مجموعی تصورِ کائنات و انسان کو مکمل اور واضح کرنے کے بجائے الٹا ناقص اور مسخ ہی کرتی چلی جائے گی۔

اسلام دراصل ہماری اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ وہ ہر قسم کی تحقیقات کے لیے جو نقطۂ آغاز ہم کو دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کر کے یا بہت سے خداؤں کی رزمگاہ سمجھ کر تحقیق کی ابتدا نہ کرو بلکہ یہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھنا شروع کرو کہ یہ ایک خالق کی تخلیق اور ایک قادرِ مطلق کی سلطنت اور ایک حکیم کی دانائی کا کرشمہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے آپ کو (اور فی الجملہ نوعِ انسانی کو) غیر محکوم و غیر مسئول، یا مجبورِ محض، یا مختارِ کل سمجھتے ہوئے مطالعے کی ابتدا نہ کرو بلکہ اس حیثیت سے مطالعہ شروع کرو کہ تم سلطنتِ کائنات میں ایک ایسی رعیت ہو جس کی طرف کچھ اختیار

منتقل کیا گیا ہے اور اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال میں تم مسئول ہو۔

بس یہی ہر مطالعہ و تحقیق کے لیے ایک صحیح نقطۂ آغاز ہے۔ رہے دورانِ تحقیق میں پیش آنے والے وہ بہت سے جزئیات جن سے انسان کو مختلف علمی شعبوں میں سابقہ پیش آتا ہے، تو ان میں اسلام اس کے سوا کسی بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ ہمارے اخذ کردہ نتائج اُن حقائق سے نہ ٹکرائیں، جن کی صراحت کتاب اللہ میں پائی جاتی ہو۔ اگر بالفرض کسی جگہ بعض حقائق مشہودہ (Observed facts) سے ہم کو ایسے نتائج نکلتے نظر آئیں جو تصریحاتِ کتاب سے متصادم ہوتے ہوں، تو پھر ہمیں غور سے دیکھنا چاہیے کہ کہیں ہمارے مشاہدے یا طریقۂ استنتاج میں تو کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ خیال رہے کہ تصادم اگر ہو سکتا ہے تو حقائق و واقعات اور تصریحاتِ کتاب میں نہیں بلکہ نتائج مستخرجہ اور تصریحاتِ کتاب میں ہو سکتا ہے، اور اس صورت میں نظرِ ثانی کتاب پر نہیں بلکہ نتائج مستخرجہ پر ہونی چاہیے، کیونکہ نتائج مستخرجہ حقائقِ مشہودہ کی طرح کوئی یقینی چیز نہیں ہیں۔

اِن اصولی باتوں کو سمجھنے کے بعد اب اپنی تحقیق کا راستہ تلاش کرنا آپ کا اپنا کام ہے۔

(۸) دواؤں اور غذاؤں میں کیا چیزیں پاک ہیں اور کیا ناپاک، اس کو جاننے کے لیے آپ کو کچھ نہ کچھ حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جہاں تک احکامِ قرآنی کا تعلق ہے اس سلسلے میں آپ کو تفہیم القرآن سے کافی مدد مل جائے گی۔ مگر پھر بھی حدیث اور فقہ کے مطالعے کی ضرورت باقی رہتی ہے تاکہ آپ اصولی احکام سے بھی واقف ہو جائیں اور جزئی مسائل سے بھی۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں اب تک میڈیکل کالج کی تعلیم میں شرعی احکام کی تعلیم شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے۔ آخر ہم کیسے اس چیز کی ضرورت محسوس کریں جسے ہمارے استاد (انگریز) نے غیر ضروری سمجھا تھا!۔

(۹) مسلم حکماء نے فنِ طب کو کس طرح مسلمان بنایا تھا، اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو تو کوئی صاحب علم طبیب ہی کر سکتا ہے۔ مَیں اس کے متعلق صرف ایک مجمل بات ہی کہہ سکتا ہوں کہ ابتدائی دَور کے مسلم حکماء نے محض اندھے مقلدوں کی طرح اِس فن کو غیر مسلم استادوں سے جوں کا توں نہیں لے لیا تھا بلکہ اسے مشرف با سلام کیا تھا اور اُن کا یہ کارنامہ محض نسخوں پر "ہوالشافی" لکھ دینے تک محدود نہ تھا۔ انہوں نے

فنِ طب میں جو کتابیں لکھیں اُن کو دیکھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا پرست لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جو خدا کی حمد اور رسول پر درود و سلام سے کلام کی ابتدا کرتے ہیں اور بیچ بیچ میں جگہ جگہ خدا کی حکمت اور قدرت اور اس کی شانِ تخلیق اور آفاق و انفس میں اس کی آیات کی طرف اشارے کرتے جاتے ہیں۔ ان کی کتابوں کا حال موجودہ زمانے کی طبی کتابوں کا سا نہیں ہے جن میں کہیں اشارے کنایے میں بھی خدا کا ذکر نہیں آتا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ پہلے ایک طالب علم کے ذہن میں تشریح بدن اور وظائف اعضاء اور اسبابِ امراض اور خواص ادویہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ خدا پر یقین اور اس کے خالق اور حکیم اور مدبر ہونے پر اعتقاد بڑھتا جاتا تھا، اور اب یہی ساری چیزیں پڑھنے کے دوران میں ایک خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر آپ سے آپ پرورش پاتا چلا جاتا ہے، الّا یہ کہ کوئی طالب علم باہر کہیں سے ایمان باللہ ساتھ لایا ہو اور یہاں اناٹومی اور فزیالوجی وغیرہ پڑھتے ہوئے وہ بطور خود آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ بھی کرتا جائے۔

قدیم زمانے میں ہمارے حکماء نے یہ طریقہ مقرر کر رکھا تھا کہ فنِ طب کی تعلیم علومِ دینی کی تکمیل کے بعد دی جاتی تھی۔ ایک طالب علم مدرسۂ طب میں آتا ہی اس وقت تھا جب وہ ملک کی عمومی ثانوی تعلیم سے فارغ ہو چکا ہو، اور اس ثانوی تعلیم کا جزوِ لازم علم دین ہوتا تھا۔ اس لیے ہمارے ہاں کے طبیب نرے طبیب ہی نہ ہوتے تھے بلکہ عالمِ دین بھی ہوتے تھے۔ اب معاملہ اس کے برعکس ہے کہ میڈیکل کالج کے درجۂ فراغ کو پہنچا ہوا ایک طالب علم حدودِ حلال و حرام کی ابتدائی معلومات تک نہیں رکھتا۔

مزید براں ہمارے پرانے زمانے کے اطباء بالعموم زاہد و عابد لوگ ہوتے تھے، لالچ کے بغیر خدمتِ خلق کرتے تھے، فیس لینے سے اکثر اور دوا فروشی سے کلیتہً اجتناب کرتے تھے، اور ان کی ذاتی زندگی بڑی پاکیزہ ہوتی تھی۔ اس لیے طبی تعلیم کا سارا ماحول پاک اور دیندارانہ رہتا تھا اور استادوں کے عمدہ اوصاف خود بخود شاگردوں میں سرایت کر جاتے تھے، بغیر اس کے کہ طلبہ کو دیندار اور با اخلاق بنانے کے لیے کوئی مصنوعی کوشش کرنی پڑتی۔

اس کے ساتھ دوا سازی کے فن کی جو اصلاح اُن لوگوں نے کی اس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ وہ لوگ حرام چیزوں کو صرف اسی صورت میں استعمال کرتے تھے جبکہ مریض کے علاج کے

لیے ان کا استعمال ناگزیر ہو۔ ورنہ بالعموم انہوں نے اپنی دواؤں کو حرام اور ناپاک اجزاء سے پاک رکھا تھا۔

انسان کے "فطرت" پر پیدا ہونے کا مفہوم

سوال۔ حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ کا کیا مطلب ہے۔ اس سوال کا باعث آپ کی کتاب خطبات کی وہ عبارت ہے جس میں آپ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "انسان ماں کے پیٹ سے اسلام لے کر نہیں آتا" اس حدیث کا مطلب عموماً یہ لیا جاتا ہے کہ ہر بچہ مذہبِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، مگر آپ کی مذکورۂ بالا عبارت اس سے اباء کرتی ہے۔ آپ کی اس عبارت کو دیگر معترضین نے بھی بطورِ اعتراض لیا ہے۔ مگر میں اس کا مطلب کسی اور سے سمجھنے یا خود نکالنے کے بجائے آپ ہی سے سمجھنا چاہتا ہوں، کیونکہ متعدد بار ایسا ہوا ہے کہ معترض نے آپ پر اعتراض کردیا اور بادی النظر میں اس کا اعتراض معقول معلوم ہوا، مگر جب آپ کی طرف سے اس عبارت کا مفہوم بیان ہوا تو عقل سلیم نے آپ کے بیان کردہ مفہوم کی تصدیق کی۔"

جواب:۔ اِس حدیث میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ انسان خدا کے ہاں سے کفر یا شرک یا دہریت لے کر نہیں آتا بلکہ وہ خالص فطرت لے کر آتا ہے جو خدا کے سوا اپنے کسی معبود کو نہیں جانتی اور شرائع الٰہیہ کے فطری اصولوں کے سوا کسی چیز سے مانوس نہیں ہوتی۔ اگر اس فطرت پر آدمی برقرار رہے اور کوئی بگڑا ہوا ماحول اسے مشرکانہ افکار و اعمال اور گمراہانہ اخلاق و اوصاف کی طرف نہ موڑ دے تو اسے انبیاء علیہم السلام کی پیش کردہ تعلیمات کو قبول کرنے میں ذرا تامل نہ ہو۔ وہ اس چیز کو اس طرح لے جیسے اس کی اپنی چیز تھی جو کسی نے لاکر اسے دے دی۔

لیکن یہ حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ "اسلام" جس چیز کو کہتے ہیں وہ کسی آدمی کو خود بخود حاصل نہیں ہو جاتی بلکہ صرف انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے ہی ملتی ہے، اور

ایک آدمی مسلم اسی وقت ہوتا ہے جبکہ انبیاء کے پیش کردہ دین کو جان کر دل سے اس کی تصدیق کرے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص سنِ شعور کو پہنچنے تک ٹھیک ٹھیک اُسی فطرت پر قائم ہو جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا تھا، تب بھی اس کا مسلم ہونا اسی پر موقوف ہوگا کہ نبی کے واسطے سے اس کو دین ملے اور وہ اسے قبول کرے۔ جو شخص اس بات کو نہیں مانتا وہ دراصل یہ کہتا ہے کہ آدمی ماں کے پیٹ سے جو فطرت لے کر آتا ہے وہی پورا کا پورا اسلام ہے اور وہی آدمی کے ہدایت یافتہ ہونے کے لیے کافی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ شرائع کا نزول اور انبیاء کی آمد بالکل غیر ضروری ہے۔ حالانکہ قرآن جس بات کو بار بار وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو بہر حال خدا کی طرف سے ایک رہنمائی کی ضرورت ہے اور وہ ہر شخص کو براہِ راست نہیں بلکہ انبیاء کے واسطے سے ہی مل سکتی ہے، اور اسی کا اتباع قبول کرنے پر آدمی کی نجات کا مدار ہے۔ دیکھیے، جس وقت کوئی اجتماعی ماحول سرے سے موجود نہ تھا اور کسی یہودیت یا نصرانیت یا مجوسیت کا نام و نشان تک نہ تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کو خطاب کر کے فرمایا:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ - ۴)

پس اگر میری طرف سے تمہارے پاس رہنمائی آئے تو جو لوگ میری رہنمائی کی پیروی کریں گے اُن پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی جس فطرت کو اللہ نے فجور اور تقویٰ کی ایک الہامی معرفت بخشی ہے وہ اگر اپنی سلیم حالت میں بھی محفوظ ہو، پھر بھی وہ خود راستہ پا لینے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے وحی کی رہنمائی ناگزیر ہے۔ فطرت کی صلاحیت زیادہ سے زیادہ بس اتنی ہی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے جب اس کے سامنے راہِ حق پیش کی جائے تو وہ اسے پہچان لیتی ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہے، مگر وحی کے بغیر خود راہ یاب ہو جانا اس کے بس میں نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر سلیم الفطرت آخر کون ہو سکتا ہے؟ آپ کا حال یہ تھا کہ جب تک وحی نے رہنمائی نہ کی، آپ بھٹکے کھڑے تھے اور کچھ نہ جانتے تھے کہ راستہ کدھر ہے۔ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى۔ اور

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ، مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ۔

اِس اسلام کے متعلق آخر کوئی صاحب علم و عقل آدمی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ مسلمان گھر میں پیدا ہونے والے ہر آدمی کو آپ سے آپ مل جاتا ہے اور اس کے حاصل ہونے کے لیے سرے سے کسی علم و شعور اور ارادی تصدیق کی حاجت ہی نہیں ہے؟

منگنی کا شرعی حکم

سوال:۔ کیا شرعی لحاظ سے خطبۂ نکاح کا حکم رکھتا ہے؟ عوام اس کو ایجاب و قبول کا درجہ دیتے ہیں۔ اگر لڑکی کے والدین ٹھیری ہوئی بات کو رد کر دیں تو برادری میں ان کا مقاطعہ تک ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر والدین اس لڑکی کا نکاح دوسری جگہ کر دیں تو کیا یہ فعل درست ہو گا؟

جواب:۔ منگنی محض ایک قول و قرار ہے اِس بات کا کہ آئندہ اس لڑکی کا نکاح فلاں شخص سے کیا جائے گا۔ یہ بجائے خود نکاح نہیں ہے۔ البتہ فریقین کے درمیان ایک طرح کا عہد و پیمان ضرور ہے جس سے پھر جانا درست نہیں، اِلّا یہ کہ اس کے لیے کوئی معقول وجہ موجود ہو۔ اگر منگنی کے بعد فریقین میں سے کسی ایک پر دوسرے کا کوئی ایسا عیب ظاہر ہو جو پہلے معلوم نہ تھا، یا چھپایا گیا تھا، تو بلا شبہ اس قول و قرار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کی کسی معقول وجہ کے بغیر یونہی اسے ختم کر دینا، یا کسی غیر معقول وجہ کی بنا پر اس سے پھر جانا ہرگز جائز نہیں۔ دوسری بدعہدیوں کی طرح یہ بھی ایک بدعہدی ہے جس پر انسان خدا کے ہاں جواب دہ ہو گا۔

اِستمنا بالید کا شرعی حکم

سوال:۔ ایک شخص کا شباب عروج پر ہے، نفسانی جذبات کا زور ہے۔ اب ان جذبات

کو قابو میں رکھنے کی چند ہی صورتیں ہو سکتی ہیں :-

یہ کہ وہ نکاح کرے، مگر جس لڑکی سے اس کی نسبت ہے وہ اتنی چھوٹی ہے کہ کم از کم تین چار سال انتظار کرنا ہوگا۔

یہ کہ وہ اپنے خاندان سے باہر کہیں اور شادی کرلے۔ مگر ایسا کرنے سے تمام خاندان ناراض ہوتا ہے بلکہ بعید نہیں کہ اس کا اپنے خاندان سے رشتہ ہی کٹ جائے۔

یہ کہ وہ اس نیت سے کوئی عارضی نکاح کرے کہ اپنی خاندانی مخطوبہ سے شادی ہو جانے کے بعد پہلی بیوی کو طلاق دے دیگا، مگر اس میں اور متعہ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

یہ کہ وہ اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کے لیے مسلسل روزے رکھے۔ مگر وہ ایک محنت پیشہ آدمی ہے جسے تمام دن مشغول رہنا پڑتا ہے۔ اتنی محنت روزوں کے ساتھ سخت مشکل ہے۔

آخری چارۂ کار یہ ہے کہ وہ زنا سے بچنے کے لیے نکاح بالید سے کام لے۔ کیا ایسے حالات میں وہ اس طریقے کو اختیار کر سکتا ہے؟

جواب: - نکاح بالید، یعنی ہاتھ سے شہوت رفع کرنے کے بارے میں فقہاء اسلام کے تین مسلک ہیں :-

(۱) یہ کہ وہ مباح ہے اور زیادہ سے زیادہ اگر اس کے خلاف کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ مکارم اخلاق کے خلاف ہونے کی وجہ سے وہ ایک مکروہ اور ناپسندیدہ فعل ہے۔ اس مسلک کے حامی دلیل یہ دیتے ہیں کہ کسی نص میں اس فعل کے حرام ہونے کی تصریح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے اس کو وہ تمہارے لیے مفصل بیان کر چکا ہے)، لہٰذا جب محرمات کی تفصیل میں یہ مذکور نہیں ہے تو حلال ہے۔ ابن حزم نے محلی میں اس رائے کو پورے دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے، اور سند کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ حسن بصری، عمرو بن دینار، اور مجاہد اس کی اباحت کے قائل تھے، اور عطاء اس کو صرف مکروہ سمجھتے تھے (ج ۱۱ ص ۳۹۲-۹۳)۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں امام احمد ابن حنبل کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "یہ فعل

عند الضرورت اسی طرح جائز ہے جیسے فصد اور پچھنے" (ج ۱۸ ص ۱۰)۔ لیکن مجھے فقہ حنبلی کی کسی مستند کتاب میں یہ فتویٰ نہیں ملا۔

(۲) یہ کہ وہ حرام ہے، لیکن اگر زنا کے فتنے میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور آدمی اس سے بچنے کے لیے اس طریقے سے شہوت کی تسکین کرلے تو امید ہے کہ اسے سزا نہ دی جائے گی۔ یہ رائے حنفیہ کی ہے چنانچہ ردالمحتار میں تصریح ہے کہ یہ فعل حرام اور مستلزم سزا ہے، الّا یہ کہ اگر زنا کے اندیشے سے کوئی اس کا ارتکاب کرے تو یُرجیٰ اَلّا وبال علیہ (باب الصوم۔ اور باب الحدود)۔ اسی کے قریب علامہ آلوسی نے ابن ہمام کا قول نقل کیا ہے (حوالۂ مذکور)، اور اسی سے ملتی جلتی رائے علامہ ابن عابدین نے فقیہ ابو اللیث سے نقل کی ہے۔ اس رائے کے حق میں کوئی خاص نص نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کے اصولِ عامہ سے مستنبط کی گئی ہے، مثلاً حالتِ اضطرار میں حرام شے کے استعمال کی اجازت، اور دو ناجائز کاموں کے ناگزیر ہو جانے کی صورت میں کم تر درجے کے ناجائز کو اختیار کرنے کا قاعدہ۔

(۳) یہ کہ وہ قطعاً حرام ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کی یہی رائے ہے، اور وہ سورۂ مومنون کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ، فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۔

اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، بجز اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہوں، کہ (ان سے پرہیز نہ کرنے میں) وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ پھر جو اس کے سوا کوئی اور راہ (تسکینِ شہوت کی) تلاش کرے تو ایسے ہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔

اس آیت سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ منکوحہ بیوی اور ملک یمین میں آئی ہوئی لونڈی کے سوا تسکینِ شہوت کی تمام صورتیں از روئے قرآن حرام ہیں، خواہ وہ زنا ہو، یا استمنا بالید، یا عملِ قومِ لوط، یا وطی بہائم، یا کچھ اور۔ پھر اسی کی تائید یہ احادیث بھی کرتی ہیں:

ناکح الید ملعون۔ اپنے ہاتھ سے نکاح کرنے والا ملعون ہے۔

عذب الله تعالیٰ امة کانوا یعبثون بمذاکیرھم ۔

اللہ نے ایسے لوگوں کو عذاب دیا جو اپنے اعضائے جنسی سے کھیلتے تھے ۔

یہ دونوں حدیثیں علامہ آلوسی نے روح المعانی میں نقل کی ہیں ۔ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور حدیث نقل کی ہے مگر ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ یہ حدیث غریب ہے ، نیز اس کی سند میں ایک راوی غیر معروف ہے :

سبعة لا ینظر الله الیھم یوم القیامة ولا یزکیھم ولا یجمعھم مع العالمین و یدخلھم النار فی اول الداخلین الا ان یتوبوا ومن تاب تاب الله علیہ ، الناکح یدہ ، والفاعل والمفعول بہ ، و مدمن الخمر ، والضارب والدیہ حتی یستغیثا ، والموذی جیرانہ حتی یلعنوہ ، والناکح حلیلة جارہ ۔

سات آدمی ہیں جن کی طرف اللہ قیامت کے روز نظر نہ فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور نہ انہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ جمع کرے گا اور سب سے پہلے دوزخ میں داخل ہونے والوں میں شامل کریگا ، الا یہ کہ وہ توبہ کریں ، اور جو توبہ کرے اللہ اسے معاف کر دیتا ہے ۔ (۱) اپنے ہاتھ سے نکاح کرنے والا ۔ (۲) عمل قوم لوط کرنے والا ۔ (۳) یہ فعل کرانے والا ۔ (۴) عادی شراب خور (۵) اپنے والدین کو مارنے والا یہاں تک کہ وہ فریاد کریں (۶) اپنے ہمسایوں کو ستانے والا یہاں تک کہ وہ اس پر لعنت کریں (۷) اپنے ہمسائے کی بیوی سے بدکاری کرنے والا ۔

ان مختلف مسلکوں اور ان کے دلائل پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پہلا مسلک نہایت کمزور ، بلکہ غلط ہے ۔ اس لیے کہ قرآن میں حرام چیزوں کی تفصیل ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب حرام چیزوں کو نام بنام بیان کیا گیا ہو ، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں حرام و حلال کے کلی اصول بیان کر دیے گئے ہیں ۔ پس ہر وہ چیز جو قرآن کے بیان کردہ کسی کلیہ کے تحت آتی ہو اس پر وہی حکم جاری ہو گا جو کلیہ میں ارشاد ہوا ہو ، الا یہ کہ اس کو مستثنیٰ قرار دینے کے لیے کوئی دلیل موجود ہو ۔ اب سوال یہ ہے کہ جب یہ قاعدہ عام قاعدہ بیان کر چکا ہے کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا قضائے شہوت کے تمام طریقے حدود اللہ سے ...

تو اس سے نکاح بالید کے مستثنیٰ ہونے کی آخر دلیل کیا ہے؟ اس کے جواب میں بعض لوگوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ "عرب میں اس فعل کا کوئی رواج نہ تھا، نہ کلام عرب میں اس کا کوئی ذکر ہے، لہٰذا فمن ابتغی وراء ذالک میں یہ داخل نہیں ہے۔" لیکن یہ دلیل دو وجوہ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ لغتِ عرب میں اس کے لیے جَلْد عُمَیرہ اور خَضْخَضَہ کے الفاظ موجود ہیں، اور زبان میں کسی لفظ کا موجود ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اہل زبان اس تصور سے آشنا تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر عرب اس سے واقف نہ تھے تو خدا تو انسانوں کے سب احوال سے واقف تھا۔ اس کے بیان کردہ کلیات صرف اُنہی جزئیات تک آخر کیسے محدود ہو جائیں گے جن سے اُس زمانے کے عرب واقف ہوں۔

اِن دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت زنا، اور عمل قوم لوط اور وطی بہائم کی بہ نسبت کم تر ہے۔ اس لیے اگر کسی شخص کو اِن گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لیے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعے سے کرے تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔"

اب اُس خاص شخص کا مسئلہ لیجیے جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے۔ اس کو پہلے تو میں اللہ تعالیٰ کی یہ نصیحت یاد دلاؤں گا کہ

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (النور۔ ۳۳)	اور چاہیے کہ وہ لوگ باعفت رہنے کی کوشش کریں جو نکاح کا موقع نہیں پاتے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے۔

پھر میں اس سے صاف کہوں گا کہ تمہارے معاملے میں وہ حالت ہرگز موجود نہیں ہے جسے تم ایک حرام چیز کو حلال کرنے کے لیے معذرت کے طور پر پیش کر رہے ہو۔ تم محض اپنے خاندان کے خوف سے نکاح نہیں کرتے، حالانکہ اس خاندان نے ایک جوان آدمی کو ایک کم سن لڑکی کے ساتھ منسوب کر کے اپنی نادانی کا پورا ثبوت دے دیا ہے۔ اب اگر تم نکاح کے مواقع پاتے ہو مگر خاندان کی ناراضی

سے ڈر کر نہیں کرتے تو خواہ تم کوئی سا گناہ بھی کر دو، خدا کے ہاں ضرور ماخوذ ہو گے، کیونکہ حقیقی مجبوری تو ہیں کوئی نہیں ہے۔ حجتیں ڈھونڈھنے کے بجائے سیدھی طرح فیصلہ کر و کہ خوف کا مستحق کون زیادہ ہے؟ خدا یا خاندان؟

عذرِ شرعی کی تشریح

سوال: - عذرِ شرعی کے متعلق کوئی واضح حدود مقرر ہیں یا یہ حالات اور مواقع کے مطابق بدلتے رہتے ہیں؟ جماعتی کاموں میں حصہ لینے کے لیے کچھ رفقا اس بنا پر سفر نہیں اختیار کرتے کہ انہیں اپنے روزگار سے علیحدہ ہونے کا ڈر ہے جس میں مسجد کی امامت بھی شامل ہے۔ لہٰذا عذرِ شرعی کی جامع سی تعریف سے مطلع فرمائیں۔

جواب - عذرِ شرعی کی کوئی جامع اور مانع تعریف جس کے بعد کسی بحث و نزاع کی گنجائش ہی باقی نہ رہے بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے کچھ حدود ہی معین نہیں ہیں اور ہر قسم کے لچر اور چھوٹے عذرات کو عذرِ شرعی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ شریعت کے کتنے احکام ہیں جن کے بارے میں اللہ اور رسولؐ نے خود تصریح کے ساتھ وہ عذرات بیان کر دیے ہیں جن کی موجودگی میں آدمی یا تو ان احکام کی ذمہ داریوں سے بری ہو جاتا ہے یا کم از کم ان کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً خوف، بیماری اور سفر کی حالت میں نماز کا حکم۔ پانی نہ ملنے یا بیمار ہونے کی صورت میں وضو کا حکم۔ عدمِ استطاعت کی حالت میں حج کا حکم۔ بیماری اور سفر وغیرہ صورتوں میں روزے کا حکم۔ ضروری سامانِ جہاد فراہم نہ ہو سکنے کی صورت میں جہاد کا حکم۔

ان تمام صورتوں میں شریعت نے جن چیزوں کو عذرِ شرعی کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے بعض حالات میں ان کے واقعی اور غیر واقعی ہونے پر بحث ہو سکتی ہے اور ایک کمزور ایمان کا آدمی بالکل غیر واقعی عذرات کو بھی شریعت کی ذمہ داریوں سے نکلنے کے لیے بہانہ بنا سکتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

ان کے حدود بالکل غیر معتین اور مجہول ہیں۔ بڑی آسانی کے ساتھ دو معقول آدمی ایک شخص کے عذرات کو سُن کر اور اس کی مجبوریوں کو معلوم کر کے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فی الواقع وہ ایک حکم شرعی کی تعمیل سے معذور ہے یا محض ٹال مٹول کر رہا ہے۔

یہ تو آپ کی بات کا اصولی جواب ہوا اب خاص جماعت کے معاملے کو لیجیے۔

جماعت کا ہر رکن حدودِ شریعت کے اندر امیرِ جماعت اور اس کے مقرر کیے ہوئے امرا کی اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اس عہد کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ امیرِ جماعت اور اس کے مقرر کیے ہوئے امرا حدودِ شرع کے اندر جس بات کا حتمی طور پر حکم دیں اس کی اطاعت کی جائے، الا آنکہ کوئی ایسا عذر معقول ہو جس کو شریعت میں عذر تسلیم کیا گیا ہو، یا جس کو شریعت کی روشنی میں عذر تسلیم کیا جا سکتا ہو۔ مثلاً بیماری، یا عدمِ استطاعت، یا وسائلِ کار کی عدم موجودگی، یا پیشِ نظر کام کے مقابل میں کسی بڑے مقصد یا کام کے نقصان کا اندیشہ وغیرہ۔ اس طرح کی بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں جو عذر بن سکتی ہیں اور جن کی بنا پر کسی شخص کو جماعت کی بعض ذمہ داریوں سے سبک دوش قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خاص طرح کے لوگوں کے بعض خاص حالات بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو ان کے لیے عذر بن سکتے ہیں۔ مثلاً جو لوگ تعلیمی مشغولیتوں میں مصروف ہیں، یا ملازمت کی پابندیوں میں بندھے ہوئے ہیں جماعت کی بعض ذمہ داریوں کے ادا کرنے سے واقعی مجبور ہوتے ہیں اور یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کا لحاظ کیا جائے۔ بعض خاص حالات میں مسجد کی امامت بھی عذر بن سکتی ہے، مثلاً یہ کہ امام مسجد کو جس کام کے لیے بھیجا جا رہا ہے اس کی دینی مصلحت اس کے فرائضِ امامت کے مقابل کم تر ہو۔

اس قسم کے جتنے اختلافات پیدا ہوں، یعنی جہاں یہ سوال سامنے آئے کہ فی الواقع عذر رکھنے والے کا عذر معقول ہے یا نہیں، تو اس کا تصفیہ میرے خیال میں ہر حلقے کے امیر اور اس کی مجلس شوریٰ کو کرنا چاہیے۔ وہ سارے سارے حالات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ عذر کرنے والے کا عذر معقول ہے یا نہیں۔ اور اس بات کو یاد رکھیے کہ میرے نزدیک ہر معقول عذر، عذرِ شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔

مطبوعات

مصباح القرآن | تالیف شیخ محمد نصیب صاحب مرحوم بارایٹ لا (گورداسپور)۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات مجلد۔ تقطیع ۲۰×۲۶ ملنے کا پتہ دار البلاغ محمد نگر، اقبال روڈ، لاہور۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

یہ قرآن مجید کے مضامین کا انڈکس ہے جس میں بائیس مختلف عنوانات قائم کرکے ان کو متعدد ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر ہر عنوان کے تحت قرآن مجید کی متعلقہ آیات کا اردو ترجمہ اور سورہ ورکوع کا نمبر دے دیا گیا ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کے وسیع اور ہمہ گیر مضامین کا احاطہ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے اور ایک مختصر کتابچے میں سارے مطالب قرآنی نہیں سما سکتے، تاہم مؤلف مرحوم کی اِس کوشش سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں مرحوم کی اس سعی کو سعیِ مشکور کا درجہ دے گا۔

صراطِ مستقیم | تالیف ابو محمد احمد حکیم محمد حسین صاحب علوی۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ ملنے کا پتہ، مکتبہ ارباب اردو، موہن پورہ، راوی روڈ، لاہور۔ قیمت بلا جلد ۱۲ ار مجلد ایک روپیہ۔

اس کتاب کے پہلے باب میں اجزائے ایمان و ارکان اسلام اور اُن سے تعلق رکھنے والے مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں فضائل اخلاق، آداب معاشرت اور صلۂ رحمی کی تلقین اس طرح کی گئی ہے کہ قرآن مجید میں سے ۵۰ سے زاید متعلقہ آیات کے ایک انتخاب کو ترتیب دے کر ترجمہ و تشریح کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ تیسرا باب مختصر سیرت نبوی پر ہے۔ چوتھے باب میں نماز کے اذکار اور قرآن کی آخری چند سورتوں کو معہ ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ پانچویں اور آخری باب میں پچاس سے زائد احادیث اور تیس سے زائد ادعیہ مسنونہ کا ترجمہ دے دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب سکولوں کے طلباء کے معیار و ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے، لیکن آج کل کے علم دین کے عام فقدان کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پڑھے لکھے مسلمانوں کی اکثریت بھی اِس سے کافی فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ کاغذ اور طباعت اگرچہ معیاری

نہیں، مگر کتابت بہتر ہے۔

مسک الختام فی ختم النبوۃ علی سید الانام | تصنیف مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، جامعہ اشرفیہ لاہور، ضخامت ۱۰۴ صفحات۔ ناشر مکتبہ صدیقیہ بیرون بوہڑ دروازہ، ملتان۔ قیمت ۵ ر

مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی امت نے نبوت اور ختم نبوت کے بنیادی عقیدے کا جس طرح انکار کیا ہے اور قرآن و حدیث کے نصوصِ صریحہ کے معنی اور سلف سے لے کر خلف تک کے مسلمانوں کے متفق علیہ تصورات کے اندر الحاد پیدا کرنے کی جو ناپاک کوششیں کی ہیں، ان کے جواب میں یہ اشد ضروری تھا کہ علمائے دین ختم نبوت کے عقیدہ کی دینی اہمیت اور قرآن، سنت اور اجماع امت کی رو سے اس کے اثباتی دلائل کو زیادہ سے زیادہ واضح اور اجاگر کرنے کی کوشش کریں۔ زیر نظر تالیف اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے حضرت مؤلف نے سب سے پہلے اصطلاح خاتم النبیین کے معنی و مفہوم کی تشریح قرآن و حدیث کی روشنی میں کی ہے۔ پھر اس بارے میں قادیانی تاویلات و تعبیرات کا رد کیا ہے اور اُن احادیث و آثار کا مدعا واضح فرمایا ہے جنہیں قادیانی اپنے عقائد باطلہ کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ان اکابر صوفیہ کے اقوال پر بحث کی ہے جن سے بالعموم قادیانی اپنے حق میں استدلال کیا کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس بحث کا بڑا حصہ ہمارے نزدیک اطمینان بخش نہیں ہے۔ ہم جس طرح نبوت کی ظلی و بروزی وغیرہ اقسام کے قائل نہیں ہیں اسی طرح ہم نبوت کی تشریعی و غیر تشریعی تفریق کے بھی قائل نہیں ہیں۔ نہ ہم یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ "نبوت" "ولایت" اور "شریعت" دو شعبوں میں منقسم ہے اور نہ ہم اس کے ماننے پر آمادہ ہیں کہ ان اقسام و شعبہ جات میں سے بعض ختم اور بعض جاری ہیں۔ عقیدۂ نبوت و رسالت اجزائے ایمان میں سے ایک اہم جزء ہے۔ اس کا اصل مأخذ کتاب اللہ ہے اور اس کے اجمالی تصور کی تفصیلات احادیث صحیحہ میں موجود ہیں۔ وہاں نبوت کا ایک بسیط تصور ملتا ہے اور اقسام و اجزاء کا اشارہ تک نہیں ملتا۔ جہاں تک بخاری کی اِس حدیث کا تعلق ہے کہ لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَات، ہم اس میں مستثنیٰ منقطع کے قائل ہیں۔ اِس حدیث کا مطلب ہمارے نزدیک یہ نہیں کہ "نبوت میں سے اب صرف بشارت دینے والے خواب باقی

ہیں۔" بلکہ یہ ہے کہ "نبوت ختم ہو چکی ہے، اب صرف مبشرات باقی رہ گئے ہیں"۔ اسی معنی کی تشریح دوسری حدیث کرتی ہے کہ ذھب النبوۃ وبقیت المبشرات۔

کتاب کی زبان، انداز بیان، طرز استدلال حتیٰ کہ کتاب کے نام میں بھی قدامت کا رنگ نمایاں ہے۔ محترم مؤلف اور دیگر علماء کرام سے ہماری درخواست ہے کہ وہ طرز نگارش اور اسلوب بیان کو سہل بنانے اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔ اُن کے علمی افادات کے اصل مخاطب و محتاج وہ چند حضرات نہیں ہیں جنہوں نے علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرکے سند فراغ حاصل کر لی ہے بلکہ مسلمانوں کی وہ اکثریت ہے جو معمولی لکھی پڑھی ہے یا جس نے جدید تعلیم حاصل کی ہے اور در اصل سمجھانے کی ضرورت انہی لوگوں کو ہے، کیونکہ سب سے زیادہ گمراہی کے خطرے میں یہی لوگ مبتلا ہیں۔ عقیدۂ ختم نبوت کی جو اہمیت دین میں ہے اور قادیانی فتنے نے جو صورت حالات پیدا کر دی ہے اُس کی وجہ سے ضرورت اِس امر کی ہے کہ ایسی کتابوں کا انداز تحریر و استدلال سہل اور آج کل کے ذہنوں کو اپیل کرنے والا ہو، تاکہ ان کی اشاعت عام ہو۔ لیکن علماء کی بعض تحریرات میں اس کی بڑی کمی ہے مثلاً اسی کتاب کے صفحہ ۱۳ اور ۱۴ کے بعض فقرات ملاحظہ ہوں جو آیۂ خاتم النبیین کی تفسیر کے دوران میں تحریر ہوئے ہیں:-

"آیت مذکورہ کے پہلے جملے میں ابوت جسمانیہ کی نفی فرمائی اور دوسرے میں ایک شبہ کا ازالہ فرمایا۔ . . . وہ یہ کہ ابوت کی نفی سے شفقت کی نفی کا شبہ ہوتا تھا کہ شاید جب ابوت منتفی ہوگئی تو شفقت پدری جو ابوت کا خاصۂ لازمہ ہے وہ بھی منتفی ہو جائے تو ارشاد فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے ساتھ جسمانی ابوت کا علاقہ نہیں لیکن علاقۂ نبوت و رسالت ہے اور رسول امت کا روحانی باپ ہوتا ہے جو شفقت و عنایت میں جسمانی باپ سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے اور چونکہ بیٹا باپ کا وارث ہوتا ہے، اس لیے اثبات نبوت توریث نبوت کو موہم تھی اس لیے شبہ کے ازالہ کے لیے خاتم النبیین کا لفظ بڑھایا۔"

ایسی زبان عربی مدارس کے درس میں تو سمجھ جاتی ہے مگر ایک عام اردو دان کے لیے اس کا سمجھنا

آسان نہیں۔

تاہم ان گذارشات سے کتاب کی افادیت یا جس مقصد اور جذبہ کے تحت یہ تحریر ہوئی ہے اس کا استخفاف ہرگز مقصود نہیں ہے۔ ناشرین کا یہ فعل بھی قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے جو قیمت رکھی ہے وہ اصل لاگت سے اگر کم نہیں تو شاید زیادہ بھی نہ ہوگی، اور مفت تقسیم کرنے والوں کے لیے اور تاجر حضرات کے لیے ۲۵ فی صد کی مزید کمی کر دی ہے۔ کتابت و طباعت کا معیار بھی اچھا ہے۔

مرزائیوں کی خوفناک چالیں۔ مرزائیوں کے خطرناک ارادے۔ مرزائیوں کا اصلی چہرہ

یہ تینوں رسالے بھی مکتبۂ صدیقیہ، ملتان کے شائع کردہ ہیں۔ ہر ایک کی قیمت ایک ایک آنہ ہے پہلے رسالے کی ضخامت چوبیس صفحات اور بقیہ دونوں کی سولہ سولہ صفحات ہے۔

اگرچہ قادیانیوں کی مخصوص ذہنیت کی جھلک اُن کے ہر قول و فعل میں نمایاں ہوتی ہے لیکن اُن کے بنیادی عقائد و افکار، اور حقیقی عزائم اور منصوبوں کا کوئی صحیح اندازہ اُس تبلیغی لٹریچر سے نہیں ہو سکتا جسے یہ لوگ خاص "سلیقے" اور احتیاط کے ساتھ مرتب کر کے وقتاً فوقتاً اپنی امت سے باہر کے لوگوں کو ہدیۃً پیش کرتے یا بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کے عقائد و نظریات معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی مرزا غلام احمد آنجہانی اور اُن کے خلفاء کی اُن تحریروں کا مطالعہ کرے جو ان کی بنیادی دعوت کو پیش کرتی ہیں یا پھر اُن اخبارات و رسائل کو دیکھتا رہے جو اس جماعت کے آرگن اور ترجمان ہیں اور جن میں اکثر جماعتی ہدایات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تینوں زیرِ تبصرہ رسالہ جات اسی تصویر کے دوسرے اور حقیقی رُخ کو پیش کرتے ہیں۔ ان رسائل میں اصل قادیانی مآخذ سے پورے حوالوں کے ساتھ چند ایسے اقتباسات دیے گئے ہیں جن سے بہت آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ قادیانیت کا تمام دنیا کے مسلمانوں کے مقابلے میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی موقف کیا ہے۔ ناشرین نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ اگر ناظرین کو قادیانی کتب کے جدید ایڈیشنوں میں حوالے نہ مل سکیں تو وہ ملتان خط لکھ کر اصل حوالے طلب کر سکتے ہیں۔ مفت تقسیم کرنے والے اور تاجر حضرات یہ رسالے تین روپے دو آنے فی سینکڑہ کے حساب سے خرید سکتے ہیں۔

احمدیت اور اسلام و ختم نبوت | شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام کراچی۔ قیمت دس آنے ضخامت ۹۴ صفحات۔

یہ کتابچہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ علامہ اقبال مرحوم کے اُن انگریزی خطوط و مقالات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۳۵ء کے اوائل میں قادیانیت کے بارے میں تحریر کیے تھے۔ دوسرا حصہ چودھری غلام احمد پرویز صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ کتاب کا آغاز ادارۂ مذکور کے اِس دعوے سے ہوا ہے کہ جو مسئلہ پچاس برس سے مولوی صاحبان سے حل نہیں ہوا تھا اُسے "خالص قرآنی روشنی" میں اقبال اور "ترجمان اقبال" نے چند منٹوں میں حل کر دیا ہے۔

علامہ اقبال کی جو تحریریں اس کتابچے میں جمع کی گئی ہیں ان میں وہ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی وحدت دینی و ملی کا انحصار کسی نسلی یا جغرافی یا کسی دوسرے مادی رشتۂ اتحاد و اشتراک کی بنا پر نہیں ہے بلکہ تمام تر عقائد و افکار کی بنا پر ہے۔ اس لیے ختم نبوت کے انکار اور اجرائے نبوت کے اقرار سے مسلمانوں کا دینی اور قومی شیرازہ معاً منتشر ہو جاتا ہے۔ اُس زمانے میں پنڈت نہرو، بعض پارسی اور روشن خیال مسلمان قادیانیوں کے ساتھ رواداری برتنے کی تلقین کرتے تھے حتیٰ کہ سبھاش چندر بوس نے اس خیال تک کا اظہار کر دیا تھا کہ ہم عرب کے نبی کی پیروی کرنے والوں پر ایک ہندوستانی نبی کے ماننے والوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اِس پر مرحوم نے فرمایا کہ اس معاملے میں رواداری بے غیرتی اور قومی خودکشی کے مترادف ہے۔ آخر میں انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ قادیانی ایک الگ امت ہونے کے باوجود قلت تعداد میں ہونے کی وجہ سے الگ اقلیت قرار دیے جانے کا مطالبہ نہیں کرتے، مگر مسلمانوں کے لیے اور حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ انہیں اقلیت قرار دے۔ علامہ مرحوم کے استدلال کے اکثر حصوں سے ہمیں اتفاق ہے۔ مگر بحث کے بعض پہلوؤں سے ہمیں شدید اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر مقالے کے آخر میں انہوں نے اپنے ہم عصر "مصلحین" (زغلول پاشا، کمال اتاترک، رضا شاہ) کی اُن اصلاحات کی بھی مدافعت فرمائی ہے جو قرآن کے صریح نصوص و احکام کے خلاف تھیں۔ اقبال کے خیال میں فقہ اسلامی کی رو سے ایک مسلمان امیر ریاست کا امیر اس بات کا مجاز ہے کہ شرعی قوانین (مثلاً قانون وراثت

اور تعددِ ازدواج، کو منسوخ کردے۔ یہ فقہ اسلامی کی رُو سے قرآنی احکام میں ترمیم و تنسیخ کا جواز نکالنا، اور جس ریاست میں ایسے "اصلاح یافتہ" قوانین نافذ ہوں اُسے اسلامی ریاست کہنا، اور اُس کے صدر کو اسلامی ریاست کا امیر قرار دینا ایک عجیب چیز ہے اور پھر اہلِ قرآن کا ایسی تحقیق اَنیق پر صاد کر کے اِسے شائع کرنا اس سے بھی عجیب تر۔ اقبال نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تاریخ بتا دے گی کہ "یہ غلطیاں" مفید نتائج بھی برآمد کر سکتی ہیں۔ اِن غلطیوں سے جو "مفید" نتائج برآمد ہوئے ہیں، وہ اور پھر اُن کا جو ردِ عمل ہُوا ہے وہ بھی سامنے آ چکا ہے اور آتا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ مسئلہ اب زیادہ محتاجِ بحث نہیں رہا۔

چودھری غلام احمد صاحب نے مرزا غلام احمد کی نبوت کا چند نکتوں میں ٹھیٹھ قرآنی رد کرنے کے لیے جو طرزِ استدلال اختیار کیا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے: تاریخ انسانی کو وہ دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا حصہ وہ جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے گزرا۔ دوسرا وہ جو حضور کی بعثت کے بعد شروع ہُوا۔ پہلے حصے کو چودھری صاحب عہدِ طفولیت قرار دیتے ہیں اور دوسرے کو عہدِ رُشد و شباب۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اب چونکہ انسانی ذہن سنِ تمیز و شعور کو پہنچ گیا ہے، اس لیے اب اُس کی وقتاً فوقتاً رہنمائی کے لیے آئندہ مزید انبیاء کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کے ذہن اور نبوت کے بارے میں یہ ارتقائی نظریہ پرویز صاحب کی اپنی تخلیق نہیں ہے بلکہ اسے بھی اقبال مرحوم کی بعض تحریروں سے مستعار لیا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک ختمِ نبوت کے لیے یہ استدلال اپنے مقدمات کے لحاظ سے بھی غلط ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے بھی۔ انسانی ذہن کا ارتقاء جس پر اس پورے استدلال کی بنا رکھی گئی ہے، صرف عالمِ مادی و طبیعی کی معلومات تک محدود ہے۔ رہا دینی و اخلاقی شعور، تو اس معاملے میں ذہنِ انسانی کا زمانی ارتقاء کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ آغازِ انسانیت سے لے کر آج تک پاکیزہ ترین تصورِ ایمان و اخلاق رکھنے والے انسان اور بدترین عقائد و اخلاق رکھنے والے انسان ہر دور اور ہر زمانے میں پہلو بہ پہلو پائے گئے ہیں۔ نوعِ انسانی نے تاریخی و زمانی تدریج کے لحاظ سے اخلاق و ایمان میں ترقی کے کوئی مدارج طے نہیں کیے ہیں۔ دیدۂ روزگار نے ہر زمانے میں عقیدہ و اخلاق کی انتہائی بلندی اور انتہائی

پستی کے مناظر کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس لیے ختم نبوت کے حق میں یہ دلیل سرے سے غلط ہے۔ پھر اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ قادیانیت کے ساتھ ساتھ خود اسلام کی جڑ بھی کاٹ دیتا ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ پہلے انبیاء کی ضرورت اس لیے تھی کہ انسان بچہ تھا اور اب ان کی ضرورت اس لیے نہیں رہی کہ اب انسان سن رشد کو پہنچ چکا ہے، تو اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب انسان کو سرے سے ہدایت بذریعہ نبوت کی حاجت ہی نہیں رہی۔ یہ ایک ایسا تیر ہے جس نے بیک وقت قادیانیت اور اسلام دونوں کو مجروح کر دیا ہے۔

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ ایک نبی کے بعد دوسرے نبی اور ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب کی ضرورت اُسی صورت میں پیش آتی ہے، جبکہ سابقہ کتاب اور نبوت یا تو عالمگیر نہ ہو، یا اُس کی تعلیمات محفوظ نہ رہی ہوں۔ چونکہ اللہ کی آخری کتاب اور نبوت عالمگیر بھی تھی اور اس کی تعلیم بھی تحریف سے محفوظ کر دی گئی اس لیے کتب و انبیاء کی مزید ترسیل بھی غیر ضروری ہو گئی۔ یہ دلیل معقول بھی ہے اور واقعی بھی۔ اسے چھوڑ کر اگر یہ کہا جائے کہ انسان "جوان" ہو جانے کی وجہ سے آئندہ "نئے سہاروں" سے مستغنی ہو گیا ہے، تو پھر آخر اس بلوغ ذہنی کے بعد "پرانے سہاروں" کی بھی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

سرفرازیٔ ملت کے اسرار | مصنف ڈاکٹر شیدا قادری صاحب رام نگری۔ ناشر مکتبہ تعمیرِ انسانیت نمبر ۲۵ گجر گلی، موچی دروازہ لاہور۔ قیمت ۶ ر

۲۰ صفحات کا یہ مختصر رسالہ مسلمانوں کی پستی۔ صدیوں کی مسلسل پستی — کے اسباب تلاش کرنے، ان اسباب کا علاج بتانے اور مسلمانوں کی دوبارہ ترقی کے ذرائع بیان کرنے کے لیے لکھا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ باوجود اختصار کے بہت سی اچھی اور صحیح باتیں کہی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ "انہوں نے انبیاء سابقین کی امتوں کی طرح دین حق کی روح کو فراموش کر دیا ہے اور اپنی پسند اور خیالات کے مطابق اصول و ضوابط وضع کر لیے ہیں۔ اور انہی کے مطابق زندگیاں گذار رہے ہیں اور ان کا انجام بھی ٹھیک دیگر امتوں کا سا ہو رہا ہے۔۔۔" اسی طرح دوبارہ ترقی کرنے کے

لیے بھی ڈاکٹر صاحب نے یہ بات بالکل حق کہی ہے کہ "جب تک مسلمان خود رائی اور خود پسندی کو خیرباد کہہ کر احکام ربانی پر عمل پیرا نہ ہوں اس وقت تک . . . . . نہ بنی نوع انسان کو بربادی سے بچا سکتے ہیں، نہ خود مشکلات سے عہدہ برآ ہو کر سرفراز و سربلند ہو سکتے ہیں۔" دلائل کی پشت پر موقع موقع سے آیات قرآنی اور نظائر قرن اول بھی موجود ہیں۔

کتابت و طباعت ٹھیک ہے۔ ٹائیٹل رنگین اور خوشنما ہے۔ سن تصنیف یا سن طباعت نہ ہونے سے اُس ماحول کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جس سے متاثر ہو کر مصنف نے ان خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب اس قابل ہے کہ ہر پڑھا لکھا سمجھدار آدمی اس کا مطالعہ کرے۔

قوموں کا عروج و زوال | مصنف سید حامد علی صاحب۔ ناشر مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رامپور یوپی ہندوستان۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۴۸ صفحات، قیمت ۸ آنے۔

سید حامد علی صاحب اسلامی لٹریچر کے حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے اس کتابچے میں قوموں کے عروج و زوال کے عام اسباب کے ساتھ ساتھ اُس نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے جو قرآن میں پیش کیا گیا ہے اور اخلاقی طاقت اور مادی طاقت کے اس تناسب پر گفتگو کی ہے جو کسی قوم کو ترقی یا تنزل کی راہ پر لے جاتا ہے۔ پھر مسلمانوں کا ذکر کر کے ان کی ان صفات کی نشاندہی کی ہے جنہوں نے ان کو کبھی بام ترقی پر پہنچایا تھا اور ان بنیادی خرابیوں کو واضح کیا ہے جنہوں نے ان کو پستی کے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں ان سے زیادہ پست کوئی اور نہ رہا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اقوام اور انسان کے مقاصد زندگی اور ان مقاصد کے حصول کے ذرائع، اور قرآن کے پیش کردہ مقصد زندگی اور اس کے حصول کے لیے قرآن کے پیش کردہ طریق کار کا موازنہ کر کے قرآنی ہدایت اور قرآنی نقطۂ نظر کو برحق ثابت کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب اس قابل ہے کہ مسلمانوں کو وہ راہ عمل دکھا دے جس پر چل کر وہ ایک اصول پرست، باعزت، اور اقوام عالم کی رہبری کرنے والی قوم بن سکے۔

کتابت و طباعت کا معیار زیادہ بہتر ہونے کی ضرورت ہے۔ کاغذ بھی زیادہ اچھا لگایا جاتا تو مناسب تھا۔

اسلامی اصولِ انتخاب | مصنف نعیم صدیقی۔ ناشر مکتبہ چراغ راہ کراچی۔ کتابت و طباعت اچھی۔ ضخامت $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۹۶ صفحات قیمت ایک روپیہ۔

اس کتاب میں مصنف نے پہلے اسلام کے اندر دین و سیاست کی آمیزش پر گفتگو کی ہے۔ پھر اسلام کے سیاسی نظام کا تجزیہ کر کے پاکستان میں اس کے امکانات بتائے ہیں۔ اس کے بعد مدینہ طیبہ کی اوّلین اسلامی ریاست کو نمونے کی حیثیت سے لے کر اس کے نقاطِ نظر سے اسلام کے سیاسی نظام اور اس کے اصولِ انتخاب کی تشریح کی ہے اور اس سلسلے میں خلافتِ راشدہ کے اصولِ انتخاب پر بحث کرتے ہوئے ان بہت سے اعتراضات کا خوب جواب دیا ہے جو اسلامی اصولِ انتخاب پر کیے جاتے ہیں۔ آخری فصل دورِ حاضر کے حالات میں اسلامی اصولِ انتخاب کے استعمال پر ہے اور یہی اصل مقصودِ کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے ایک ایک کر کے ان خرابیوں کا سدباب کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے جو آج کل کے انتخابات کو ایک کھیل بنا دیتی ہیں اور پھر ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے جو اسلامی طریقۂ انتخاب میں پائی جاتی ہیں اور جن کو رواج دیا جانا چاہیے۔ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ اس کو ہر وہ شخص پڑھے جسے سیاسیات سے کوئی دلچسپی ہو۔ اس میں صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی بہت سے سبق ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کتاب میں کتابت کی بعض ایسی غلطیاں ہیں جن کو مکتبہ چراغ راہ کی کسی کتاب میں نہ ہونا چاہیے تھا۔

(بقیہ اشارات) اور محضر ناموں سے کچھ نہیں بنیگا، یہ لوگ سیدھی طرح بات ماننے والے نہیں ہیں"۔ اگرچہ پہلے بھی اندازہ تھا کہ ملک میں بہت سے لوگ اب اس طرح سوچنے لگے ہیں، مگر پچھلے چند مہینوں کے ربطِ عوام سے پہلی مرتبہ ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ رجحانات ملک کی آبادی کے اتنے کثیر حصے میں سرایت کر چکے ہیں۔ اب یہ ہر شخص خود سوچ لے کہ جس قیادت نے ملک میں یہ احساسات اُبھار دیے ہیں وہ سعادت کی راہ پر جا رہی ہے یا نحوست کی راہ پر؟

ممکن ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار خود اس طرح سوچ رہے ہوں کہ "کسی نے اگر قرآن و حدیث سے اسلام کے دستوری اصول بالکل قطعی اور متین طور پر پیش کر دیے تو کیا؟ کسی مجلس میں تمام اسلامی فرقوں کے علماء نے اسلامی ریاست کی دستوری بنیادیں بالاتفاق مرتب کر دیں تو کیا؟ کسی نے اگر ہماری دستوری تجویزوں کو دلائل سے غلط ثابت کر دیا تو کیا؟ لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں نے بھی اگر تار اور خط اور محضر نامے بھیج کر اور قراردادیں پاس کر کے اسلامی دستور کے اصول تسلیم کرنے کا تقاضا کر ڈالا تو کیا؟ دستور بنانے کے آئینی طور پر مجاز تو ہم ہیں۔ اصل چیز باہر کی رائے نہیں بلکہ دستور ساز اسمبلی کے اندر کی رائے ہے۔ وہ اگر اکثریت کے ساتھ ہماری دستوری تجویزوں کو قبول کر لے تو دستور انہی کے مطابق بن کر رہیگا۔ باہر کے لوگ چیختے ہیں تو چیختے رہیں۔ ہمیں نہ ان کو دلیل سے مطمئن کرنے کی ضرورت، اور نہ اس بات کی پروا کہ کتنے لوگ ہمارے ساتھ ہیں اور کتنے نہیں ہیں۔"

یہ اگر ان کا خیال ہے تو ہم ان کے خیر خواہ کی حیثیت سے کہتے ہیں کہ آپ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اسلامی دستور کے اصول جب قرآن و حدیث سے ثابت کر دیے جا چکے اور جب تمام اسلامی فرقوں کے علماء ان کی تصدیق کر چکے اور جب جلسوں اور قراردادوں اور خطوط اور محضر ناموں سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ قوم کی عظیم اکثریت اپنی قومی ریاست کو انہی اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے، تو آپ کے لیے اور آپ کی پوری اسمبلی کے لیے صرف دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں۔ یا تو اکثریت کے مطالبے کو مان لیجیے۔ یا اگر آپ کے لیے یہ مطالبہ قابلِ قبول نہیں ہے تو سیدھی طرح تسلیم کیجیے کہ آپ اس ملک میں ایک اقلیت ہیں اور اکثریت کے منشا سے نہیں، لہٰذا آپ کو دستور بنانے کا کوئی حق باقی نہیں رہا ہے۔ ان دونوں راستوں کو چھوڑ کر اگر آپ محض آئینی پوزیشن کے سہارے یا طاقت کے بل پر کوئی تیسرا راستہ اختیار کریں گے تو یقیناً اس کے نتائج بڑے دور رس نکلیں گے۔ کسی اقلیت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اکثریت پر زبردستی اپنی مرضی مسلط کرے، خواہ اسے کیسی ہی مستحکم پوزیشن حاصل ہو۔ اس کی کوشش کی جائے تو وہ عارضی طور پر کامیاب ہو سکتی ہے، مگر ایسی کوششوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا ہے۔

لیکن اس روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص سے یہ بات کس نے سنی۔ دارقطنی میں یہ روایت اس طرح ہے کہ عن ابن شہاب عن سعد بن ابی وقاص۔ مگر ابن شہاب نے حضرت سعد کو نہیں دیکھا۔ اس لیے یہ روایت منقطع ہے۔

آخر میں ام شریک کی روایت آتی ہے جس میں مار ڈالنے کے حکم کی بھی تصریح ہے اور اس وجہ کی بھی کہ یہ جانور حضرت ابراہیم پر آگ پھونکتا تھا۔ ممکن ہے اس میں دو چیزیں خلط ملط ہو گئی ہوں۔ ایک اس جانور کا موذی ہونا، جو صحیح ترین روایت کی رو سے حضور نے فرمایا تھا، دوسرے اس کے بارے میں آگ پھونکنے کا وہ قصہ جو عوام میں مشہور تھا۔ تاہم اگر صحیح بات وہی ہو جو ام شریک والی روایت میں آئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گرگٹ کی پوری نسل کو اس لیے مار ڈالا جائے کہ اس کے ایک فرد نے حضرت ابراہیمؑ پر آگ بھڑکائی تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک موذی جانور ہے اور اس کو دوسرے موذی جانوروں کی طرح انسان سے دشمنی ہے، چنانچہ سارے جانوروں میں سے یہی وہ جانور تھا کہ جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا گیا تو اس نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ گرگٹ کی پھونک میں آگ بھڑکانے کی طاقت کہاں سے آئی اس لیے کہ حدیث میں سرے سے یہ کہا ہی نہیں گیا ہے کہ وہ آگ اس کے بھڑکانے سے بھڑکی تھی۔

(۱۴) یہ روایت مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب سترۃ المصلی میں ہے۔ اس میں امام مسلم نے وہ پورا مواد جمع کیا ہے جو سترے کے مسئلے سے متعلق ان کو معتبر سندوں سے پہنچا تھا، اور اس کے سارے پہلو ہمارے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اس کی کسی ایک روایت کو لے کر کوئی نتیجہ نکال بیٹھنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ساری روایتوں پر جامع نگاہ ڈالنے سے ہی آدمی صحیح نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ اصل بات جو ان احادیث سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازی کو اپنے آگے سترہ رکھنے کا حکم دیا تھا اور اس کی وجہ سمجھاتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ اگر آدمی سترہ رکھے بغیر نماز کے لیے کسی کھلی جگہ کھڑا ہو جائے گا تو عورتیں، کتے، گدھے سب اس کے سامنے سے گذریں گے۔ اس

کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہہ دیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا اُن کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا۔ کہو، میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے۔ کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے

(بقیہ حاشیہ ۲) قبور انبیاءھم مساجد فانی انھاکم عن ذالک (مسلم)

عبادت گاہ بنا لیتے تھے، مَیں تمہیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں۔

لعن اللہ تعالیٰ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیاءھم مساجد (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

اللہ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

ان اولئک اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علیٰ قبرہ مسجداً وصوروا فیہ تلک الصور اولئک شرار الخلق یوم القیمۃ۔ (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مردِ صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے اور اس کی تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ قیامت کے روز بدترین مخلوقات ہوں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن تصریحات کی موجودگی میں کون خدا ترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایۃً ذکر کیا گیا ہے اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل و حجت ٹھیرائے؟

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ ۱۸۴۱ء میں ریورنڈ ٹی ارنڈیل (Arundell) نے "ایشیائے کوچک کے اکتشافات" (Discoveries in Asia Minor) کے نام سے اپنے جو مشاہدات شائع کیے تھے ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر افسس کے کھنڈرات سے متصل ایک پہاڑی پر اس نے حضرت مریم اور "سات لڑکوں" (یعنی اصحاب کہف) کے مقبروں کے آثار پائے ہیں۔

۱؎ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے پونے تین سو سال بعد، نزولِ قرآن کے زمانے میں اس کی تفصیلات کے متعلق مختلف افسانے عیسائیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور عموماً مستند معلومات لوگوں کے پاس موجود نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پریس کا زمانہ نہ تھا کہ جن کتابوں میں اس کے متعلق نسبتۃً زیادہ درست (باقی ص ۲۴ پر)

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین میں مولانا نے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی.

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۴۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ضخامت ۸۲۰ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش پانچ روپے چار آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں مقامی جماعت اسلامی کے مکتبوں

یا

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور سے طلب کیجئے

تفہیمات حصہ دوم

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا اب پیش کی جا رہی ہے

زمانۂ حاضرہ کے دماغوں میں اسلام کے مبادی کو مستحکم کرنے اور اسکے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عملی روح کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی تالیفات کو جو اہمیت حاصل ہے ، محتاج بیان نہیں ۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر نے

نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں ، بلکہ پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک کے لئے بیدار اور تیار کرنے کا کام کیا ہے ۔ کر رہا ہے ، اور کرتا رہے گا ۔ انشاءاللہ ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ۔

اس میں جن اہم اور معرکۃالارا مسائل پر
گفتگو کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں

- قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے
- حقیقت جن
- معنی خلافت
- فتنہ تکفیر
- قربانی پر منکرین حدیث کا حملہ

* ہیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ
* ڈارون کا نظریہ ارتقا
* لباس کا مسئلہ
* غلامی کا مسئلہ
* نماز میں آلہ مکبرالصوت کا استعمال

ضخامت $(\frac{20 \times 26}{8})$ ۳۳۶ صفحات قیمت سات روپے صرف

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ ۔ لاہور

سرورق رہبر پرنٹنگ پریس ' بل روڈ ' لاہور میں چھپا